ہلال کشمیر

انوار ایوب راجہ

ہلالِ کشمیر

(نائیک سیف علی جنجوعہ شہید)

انوار ایوب راجہ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب:	ہلال کشمیر
مصنف:	انوار ایوب راجہ
ٹائیٹل:	
اشاعت اول:	2002
اشاعت دوئم:	2014

حصہ اوّل

- ☆ ارض پاک
- ☆ شہید کون ہے؟
- ☆ مقصد بیان
- ☆ خطہ جلال و جمال
- ☆ آخری کرن

حصہ دوم

☆ ذکرِ شہید

☆ پیدائش وخاندان

☆ عسکری زندگی کا آغاز

☆ عاشق رسول ﷺ

☆ وطن واپسی اور حیدری فورس میں شمولیت

☆ حیدری فورس

☆ حیدری فورس کی مشکلات

☆ کشمیر کے وارث

☆ جنگ آزادی کشمیر 48-1947ء کی خصوصیات

☆ فتح شکست میں بدل گئی

☆ معرکہ پیر کلیوا

☆ دشمن کا منصوبہ

☆ دشمن کے حملے کا آغاز

☆ شہادت سے پہلے

☆ ہلال کشمیر

☆ آزاد کشمیر ڈیفنس کونسل کا اجلاس

☆ گمنام ہیرو

☆ شہداء کشمیر کے کارناموں کا اعتراف

☆ تلخ حقائق

انتساب

کیپٹن راجہ جاوید اقبال شہید تمغہ ءبسالت کے نام

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارشاد خداوندی ہے کہ "جولوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ وہ مر گئے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے اور جس شخص نے اس دنیا میں جنم لیا ایک نہ ایک دن اپنی زندگی کے دن پورے کر کے راہی ملک عدم ہو جائے گا۔ مگر کچھ لوگوں کی موت ان کی بقائے دوام کا آغاز ثابت ہوتی ہے۔ تاریخ عالم اس قسم کے ہزاروں واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جن لوگوں نے ظلم و جبر استحصال و ناانصافی کے خلاف جدوجہد کے دوران حق و صداقت اور آزادی کیلئے اپنی جانیں قربان کیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو گئے۔

وطن عزیز جموں وکشمیر کی تاریخ کا ہر صفحہ وطن کے بیٹوں کی ایسی قربانیوں سے مزین ہے۔ اس لحاظ سے کیلنڈر کا کوئی دن ایسا نہیں کہ جسے یوم شہدأ کا درجہ نہ دیا جائے۔ ریاست جموں وکشمیر کے عوام تاریخ میں پہلی بار 1586ء میں دہلی کی شہنشاہت کی غلامی میں آ گئے تھے جب اکبر اعظم نے کشمیر کو تسخیر کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔

کشمیری عوام اس طویل غلامی کے دور میں مغلوں، افغانوں، سکھوں اور آخر کار ڈوگرہ خاندان کی آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ 1931ء میں اس جدوجہد نے ایک منظّم شکل اختیار کی جب شخصی مطلق العنانیت کے خلاف ایک جاندار سیاسی تحریک کا آغاز ہوگیا۔ جدوجہد کے آغاز میں ہی 31 جولائی 1931ء کو کشمیری عوام کو 28 جانوں کی قربانیوں سے ارض وطن کو سینچنا پڑا۔

1947ء میں برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی ریاست کے جنوب مغربی اضلاع میں آمریت کے خاتمے کے لئے مسلح جدوجہد کا آغاز ہوگیا اور اکتوبر 1947ء میں ہندوستانی افواج کشمیر میں داخل ہوگئیں تو اس جدوجہد کا دائرہ وسیع ہوگیا اور اب کشمیری حریت پسندوں کو ڈوگرہ آمریت کے علاوہ بھارتی جارحیت کے خلاف بھی جنگ لڑنا پڑی۔

جنگ عظیم ثانی (45-1937ء) کے دوران برطانوی ہند کی افواج میں سروس کرنے والے جموں وکشمیر کے 71667 جوانوں میں سے 60402 کا تعلق میرپور اور پونچھ کے اضلاع سے تھا۔ اگر اس وقت کشمیر میں کوئی دوراندیش اور حوصلہ مند قیادت ہوتی تو ان ریٹائرڈ فوجی جوانوں کے سہارے ایک طاقتور پیپلز آرمی تیار کی جاسکتی تھی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ تاہم جو تحریک مزاحمت اپنے طور پر وجود میں آگئی اس میں رضا کارانہ طور پر بہت سے محبّ وطن تربیت یافتہ جوانوں نے شرکت کی اور مختلف محاذوں پر داد شجاعت دیتے رہے۔ انہی سرفروشوں میں سے کئی ایک نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے شہادت کا رتبہ بھی پایا اور تاریخ کشمیر میں اپنا مقام بنا کر حیات ابدی حاصل کرلی۔

ثبت است برجریدہ عالم دوام ماہ

"ہلال کشمیر" ایسے ہی ایک سرفروش نائیک سیف علی خان جنجوعہ کی داستان شجاعت ہے جسے کوٹلی (کالاڈب) کے ایک ہونہار نوجوان قلم کار انوار ایوب راجہ نے محنت شاقہ سے قلم بند کیا ہے۔ انوار ایوب نے سرزمین کشمیر کے اس عظیم فرزند کے حالات زندگی پیدائش سے شہادت تک خاص طور پر ان کی عسکری زندگی اور جدوجہد آزادی کشمیر میں ان کے عملی کردار کی تفصیلات اکٹھی کرنے کے لئے سیف علی شہید کی بیوہ، ان کے فرزند، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقاتیں کر کے مختلف تاریخی کتب کے مطالعہ وتحقیق، سرکاری خط وکتابت اور سیف علی شہید کے ذاتی کاغذات تک رسائی حاصل کر کے شہید کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر

روشنی ڈالنے کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کے لئے وہ تبریک وتحسین کے مستحق ہیں۔

نوجوان انوار ایوب راجہ نے 1947ء کے واقعات کا جو تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے یقیناً عہد حاضر کی کشمیری نسل اس سے بھی فیض یاب ہوگی۔

جی ایم میر
میر پور آزاد کشمیر

حرف گزارش

عسکری تاریخ کا کوئی واقع ایسا نہیں کہ جس کا آغاز یا اختتام سرفروش اور جانثار سپاہیوں کی سرفروشی اور جانثاری سے نہ ہوتا ہو۔"سپاہی" کی زندگی اور موت بے مثال ہوتی ہے۔ٹم نیوآرک اپنی کتاب"Where They Fell"میں لکھتا ہے کہ

*"Battlefields are sacred land. Before the decision was made to respect the bodies of those who perished in battle, and remove them to a national cemetery where their families could mourn them, the dead and wounded were left where they fell. It was the great battle like Gettysburg in which thousands died for their beliefs in country and freedom, that persuaded public figures to celebrate the sacrifice on the field of combat....." .

ٹم نیوآرک مزید لکھتا ہے۔

*"The Gettysburg address of United States President Abraham Lincoln in 1863 marked a significant moment in the linking of battle with political liberty. It recognised that the soldiers who died for a nation's ambitions were special people, deserving of lasting respect. These honoured dead, Lincoln declared "We take increased devotion to that cause for which they gave the last full measure of devoton; that we here highly resolve that these dead shall not have died in vain......" .

ٹم نیوآرک کے الفاظ اس بات کے مکمل آئینہ دار ہیں کہ وطن کے نام پہ مرمٹنے والوں کے

وجود کو سرکاری اعزاز دیا جائے اور "جہاں وہ گرے" وہ جگہ قابل تعظیم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وطن کی خاطر قربان ہونے والا محترم اور اس کی جائے قربانی معظم ہو جاتی ہے مگر یہ تصور یورپ و امریکہ میں تو شاید ایسے معنی رکھتا ہو مگر اسلام میں ان مرنے والوں کو "شہید" کہا جاتا ہے اور ان کا اعزاز خود اللہ رب العزت کی ذات انہیں دیتی ہے۔ تاریخ اسلام کے مجاہدوں کی جاں فشانی اور قربانی کے لئے اس سے بڑی دلیل میری نظر میں نہیں گزری کہ اللہ سبحان تعالیٰ قرآن کریم میں کئی جگہ شہید و شہادت کے خود گواہ بنے۔

مادر وطن جموں و کشمیر جس کی مٹی شہیدوں کے لہو سے معطر ہے، کی جانب اٹھنے والا ہر قدم یہ احساس دلاتا ہے کہ ہاں! یہیں کسی مجاہد نے لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا ہوگا اور عزم شبیری دہراتے ہوئے جنت کی راہوں کا شہسوار ہو گیا ہوگا۔ یوں تو شہید کی شہادت ایک عزم اور حوصلے کی سعی ہے مگر میں سلام کرتا ہوں ان عظیم سپوتوں کو کہ جنہوں نے راہ حق میں کچھ اس طرح خود کو قربان کیا کہ ان کے جسموں تک رسائی بھی ناممکن ہوگئی۔ ان کا نہ مزار بنا اور نہ ہی یادگار بنی۔ بلکہ ہر دل ان کا مزار اور ہر نظر ان کی تعظیم میں اٹھی اور انہیں وہ مقام ملا کہ جسے نہ کوئی محقق و دانشور بیان کر سکا اور نہ ہی ان کے اعزاز کے لئے کسی حکومت نے کوئی کوشش کی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے "پسندیدہ لوگوں" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

معرکہ کارگل میں ایسے کئی واقعات میرے مشاہدے میں آئے جن کو نوک قلم پر لاتے ہوئے میری آنکھیں کئی بار بھیگیں اور میری روح نے ان وادیوں میں ان شہیدوں کو تلاشا کہ جن کی قربانی لازوال اور بے مثال ہے۔ یہ میرے لئے فخر کی بات ہے کہ اللہ رب العزت نے میرے قلم کو یہ وقار بخشا کہ میں مادر وطن کی ناموس کی حفاظت کی خاطر قربان ہونے والوں کی داستان شجاعت پڑھنے والوں تک پہنچاؤں۔ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید

(ہلال کشمیر) بھی ایک ایسے عظیم مجاہد کی داستان شجاعت ہے کہ جو انہی وادیوں، مرغزاروں، فلک بوس پہاڑوں اور جھرنوں میں ایک غیور کشمیری بن کر ابھرا۔ اس نے اپنے لہو سے وہ داستان رقم کی کہ جسے "داستان شجاعت" سے کم کا درجہ دینا ناانصافی ہوگا۔

محترم جی ایم میر نے میری اس نامکمل سی کوشش کو محنت شاقہ کا نام دیکر مجھے جو عزت بخشی میں اس کے لئے ان کا ممنون ہوں۔ شہدأ وطن کا عزم اور ان کی عظمت کی تفاصیل اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کشمیر جنت نظیر غلامی کی سیاہ رات سے آزادی کے روشن دن میں داخل ہوگا اور نیلم و جہلم کے متبرک پانیوں میں شامل لہو سے سینچی ہوئی مٹی پر اس کے بیٹے اللہ سبحان تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں پر شہیدوں کی میراث کی بنیاد مضبوط کریں گے۔

اے اللہ رب العزت تو گواہ ہے کہ تیرے نام کی عظمت کی خاطر جن مجاہدوں نے اپنی سب سے قیمتی چیز تیرے حضور پیش کی، نہ تو انہیں دنیاوی اعزازات چاہیے تھے اور نہ ہی ان کی عظمت کی دلیل انسانوں کے پاس ہے۔ یہ عاشقان رسول ﷺ اور تیرے حقیقی برگذیدہ بندے ہیں۔ تو ان کی قربانی کو مقبولیت بخش اور کارگل سے بھمبر تک دونوں جانب کے فریب خوردہ کشمیریوں پر کرم فرما۔ آج آزادی کے ڈیلر اور شہیدوں کے لہو کے سوداگر ہر دو جانب مصروف کار ہیں۔ تو ہی گواہ ہے کہ شہیدوں کے لہو سے پھوٹنے والی سحر غلامی کی سیاہ رات کے بعد ضرور آتی ہے اور پھر یہ تیرا ہی وعدہ ہے کہ "باطل مٹنے کے لئے ہے"۔

انوار ایوب راجہ

حصہ اوّل

ارض پاک

میرے دل میں چھپا شاعر جب کچھ کہنے کی جسارت کرتا ہے تو دل میں ایک طوفان برپا ہوجاتا ہے۔ میرا من ڈوبنے لگتا ہے اور جسم بادلوں میں تحلیل ہوکر ہمالیہ کی اس چوٹی پر جا بیٹھتا ہے جہاں غنیؒ، مہجور، حبہ خاتون، میاں محمد بخشؒ، مرزا ابوالقاسم، آشنا اور کلیم کی روحیں کشمیر جنت نظیر کو آگ اور خون کے سمندر میں ڈوبتا دیکھ کر عالم اضطراب میں ہیں۔ حسن و جمال شعر و ادب، عدل و انصاف، فکر و عمل کی اس مٹی کو جسے گنجوی نے حسن و لطافت کا مسکن، خوبرو اور خوبصورت نوجوانوں کا وطن، فردوس بریں کو شرمانے والا چمن، فلک بوس پہاڑوں، گنگناتے آبشاروں، صاف شفاف جھرنوں، لہلہتے باغوں، گھنے جنگلوں، جھومتے سبزہ زاروں، گہری نیلگوں جھیلوں، چہکتے رنگ برنگے پرندوں کی جنت کہہ کر عجوبہ فطرت قرار دیا تھا۔ گنجوی نے جس خوبصورت کشمیری کو اپنے کلام کا محور بنایا آج وہ نوجوان کئی روپ اپنائے ہوئے ہے۔ اس کا ایک روپ ابدی جنت کے طلبگار کا ہے اور وہ اس جنت کی تلاش میں جنت ارضی کشمیر کو ظالم اور غاصب کے پنجہ ظلم سے چھڑانے کے لئے سر پر کفن باندے ہاتھ میں بندوق لئے میدان عمل میں بے خوف و خطر مکار دشمن کو للکار رہا ہے۔ کبھی اسے میدان عمل سے دور کرنے کیلئے اس کے جسم سے کھال کھنچوائی جاتی ہے تو کبھی اس کے اہل و عیال کو اس کے سامنے تہہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی اس کے جسم کو توپ کے گولے سے اُڑا دیا جاتا ہے اور کبھی وہ خود میدان کارزار میں اپنی گردن کٹوا کر اپنا گرم خون کشمیر کی مٹی پر نچھاور کر دیتا ہے تاکہ مٹی کا جوش ختم نہ ہو، یہ زمین بنجر نہ ہو اور راہ حق میں گردنیں کٹوانے والوں کی نئی اور تازہ فصل سرزمین کشمیر میں اُگتی رہے۔ بوڑھی ماؤں، بیمار باپوں، جوان بہنوں اور

بیواؤں کی آہیں اور کمسن یتیموں کی سسکیاں اس غلام قوم کے آزاد لیڈروں کو خواب غفلت سے جگاتی رہیں تا کہ ہوس کے پجاریوں، اقتدار کے بھوکوں اور دنیا کی طلب میں آخرت کو بھول جانے والوں کے مردہ ضمیروں کو جگائے رکھنے کا ایک سلسلہ جاری رہے۔

مہجور اور گنجوی کی جنت ارضی کشمیر جس کے نوجوان کبھی ثمرقند و بخارا سے مہران اور مکران تک دلوں پر ہیبت طاری کرتے تھے آج ان ہی کی نسل کے محکوموں کا ایک ٹولہ آزادی کی بھیک مانگتا در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے اور اپنی کم ہمتی کو گریٹ ڈپلومیسی کا نام دے کر خود فہمی کی دلدل میں مسلسل دھنستا چلا جا رہا ہے۔ وہ جان کا نذرانہ دے کر آزادی کی شمع جلانے والوں کو یکسر بھول کر چند روزہ عیاشی اور اقتدار کی خاطر کسی بھی قیمت پر بکنے کو تیار ہے۔

ایسے ضمیر فروش ہنماؤں نے نہ صرف کشمیر جنت نظیر کے فطری حسن کو گہنایا بلکہ اس کے روحانی اثاثے اور ملی قدروں پر بھی مادیت کی چھاپ لگا دی ہے۔ ان نام نہاد لیڈروں اور آزادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے کئی چہرے ہیں جن پر بدکرداری، کرپشن، انسانی سمگلنگ سے لے کر وطن فروشی، قوم سے بیزاری اور حقیقت سے روگردانی کے بدنما داغوں کے سوا کچھ نہیں۔ بظاہر یہ لیڈر آزادی اور حرمت کشمیر کے راگ الاپتے دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت میں یہ سب ذاتی تشہیر، مالی فوائد اور عیش و عشرت کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ان خود ساختہ لیڈروں اور آزادی کے ٹھیکیداروں کی قیادت پر اگر کشمیری قوم نے بھروسہ کیے رکھا اور اس بدنام زمانہ قیادت کو مسترد نہ کیا تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ کشمیری قوم کبھی بھی آزادی کی صبح نہیں دیکھ پائے گی اور دشمن کا پنجہ ظلم اس مظلوم، محکوم اور بے حقیقت جدوجہد کرنے والی قوم پر مزید سخت ہو جائے گا۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ قومیں قیادت کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتیں اور قیادت کا شجر انسانی خون کی آبیاری مانگتا ہے۔ وہ راہنما جو اس خون کی عظمت کو سمجھتے ہوں اور

خون کا نذرانہ پیش کرنے والے شہدأ کے مشن کو آگے بڑھانے کا جذبہ رکھتے ہوں وہی راہنما قوم کی حقیقی رہنمائی کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک راہنما کا قوم سے مخلص ہونا ضروری ہے ویسے ہی قوم پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سچے جذبوں کے ترجمان لوگوں میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کرے اور پھر اس کی امامت میں اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ کشمیری قوم اور قائدین کا المیہ ہے کہ وہ ایک مشن کی تکمیل کیلئے بہت کچھ کرتے ہوئے بھی حقیقی منزل سے کوسوں دور خود فہمی اور خود فریبی کے بھنور میں مسلسل گھوم رہے ہیں اور اس خود فہمی اور خود فریبی کو تحریک آزادی کا نام دے کر دشمن کے بدارادوں کو کامیابی سے ہمکنار کر رہے ہیں۔ آپ یورپ، امریکہ اور مشرق وسطٰی کے کسی بڑے شہر کے جدید ہوٹل میں جائیں وہاں آپ کو کسی نہ کسی کشمیری لیڈر یا سیاستدان کے عیش وعشرت کی تفصیل سمیت رہائش کے شاہانہ اخراجات کا ریکارڈ مل جائے گا۔ اب آپ اس ملک کے اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی طرف دیکھیں تو لیڈر صاحب کی ایک آدھ پریس کانفرنس یا پھر ان کشمیریوں سے خطاب کی ایک آدھ جھلکی دکھائی دے گی جنہوں نے اس لیڈر پر ہزاروں لاکھوں ڈالر خرچ کرکے اسے بلایا ہوتا ہے اور اس کے اعزاز میں دعوتوں اور خریداریوں کا اہتمام کیا ہوتا ہے۔ ان لیڈروں اور تحریک آزادی کشمیر کے قائدین کی اس جماعت کے چار مشن ہیں جن کا آزادی کشمیر سے کوئی تعلق نہیں۔ اول برادری ازم کا پرچار، دوئم آزاد کشمیر کی قانون ساز اسمبلی میں سیٹ کا حصول، سوئم سرکاری حیثیت کے استعمال سے غبن اور کرپشن کے ذریعے دولت اکٹھی کرنا اور چہارم اندرون ملک اور بیرون ملک عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا۔

آزادی کے بیس کیمپ کے قائدین کے ان چار اہداف کا اثر کنٹرول لائن کی دوسری جانب بھی ہے جس کی واضح مثالیں فاروق عبداللہ، عمر عبداللہ، غلام نبی آزاد اور سوز کی

تقریریں، مکالمے اور زہر آلود بیانات ہیں جن سے ان کی منافقت، قوم سے غداری اور مٹی سے نفرت عیاں ہوتی ہے۔ یوں تو تحریک آزادی کشمیر کا آغاز اس روز سے ہوا جب یوسف شاہ چک نے سرینگر میں سنی شیعہ فسادات پر توجہ نہ دی اور فرقہ واریت کی وباء نے آن واحد میں وادی کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چک خاندان نے اپنے مسلکی جذبات کو حکومتی فرائض پر حاوی کر لیا اور سنی عالم دین قاضی محمد عیسیٰ کو سری نگر میں ہاتھی کے پاؤں تلے کچل کر سزائے موت دے دی۔ بلبل کشمیر حبہ خاتون جو اپنے باکمال اوصاف اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ایک غریب گھرانے سے شاہی محل تک پہنچی اور والئی کشمیر کی ملکہ بنی، کے بیٹے اپنی ماں کے خوابوں کو تعبیر نہ بخش سکے اور ہزاروں سال پرانی روایات کے حامل اور بدھ مت، شومت اور ناگ تہذیبوں کے امین وطن پاک کشمیر کے عوام کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے حکمرانوں کی بے انصافیوں، اقربا پروری اور مسلکی تنگ نظری سے بچاؤ کی خاطر اپنی آزادی کو غلامی میں بدل لیں۔ چک بادشاہ کی نااہل قیادت سے تنگ آ کر کشمیری علماٗ کا وفد دہلی دربار پہنچا اور مغل بادشاہ اکبر کی دیرینہ خواہش پوری کرتے ہوئے اسے کشمیر پر فوج کشی کی دعوت دی۔

کشمیری قائدین کا جو وفد اکبر کے دربار میں پہنچا اس میں شیخ یعقوب، صوفی بابا داؤد خاکی اور حیدر خان چک کے نام سرفہرست ہیں۔ تسخیر کشمیر کی اس دعوت پر اکبر نے مرزا قاسم کو ساٹھ ہزار کی ایک جری فوج دیکر بھمبر، پونچھ، اوڑی اور بارہ مولہ کے راستے کشمیر بھیجا جس کی قیادت کشمیری جرنیل حیدر خان چک ہی کر رہا تھا۔ مغلوں نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد کشمیری افواج کو غیر مسلح کیا اور آئندہ کسی کشمیری کو نہ صرف فوج میں بھرتی کرنے پر پابندی لگا دی بلکہ کشمیریوں کو ہتھیار رکھنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ سارے کشمیر کی زمین بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور کسانوں کے مالکانہ حقوق ختم کر دیئے گئے۔ مغلوں نے کشمیر میں تعمیر و ترقی کے کارہائے نمایاں تو انجام دیئے مگر شخصی آزادی اور اہل کشمیر کے قومی وقار اور خودداری کو ہمیشہ

کیلئے مسخ کر دیا۔ مغلوں نے کشمیریوں کو بکر والوں، قالین بافوں، خوانچہ فروشوں، گھریلو ملازمین اور باربرداروں کی قوم بنا کر انہیں اپنی تاریخ اور قومی تشخص سے بیگانہ کر دیا۔ 167 سالہ مغلیہ دور کے فریب سے نجات حاصل کرنے کیلئے کشمیریوں کا ایک وفد محمد شاہ کشمیری کی قیادت میں کابل پہنچا اور 1753ء میں احمد شاہ ابدالی کو تسخیر کشمیر کی دعوت دی۔

اس بار حیدر خان چک کی جگہ خواجہ ظہیر اور میر مقیم افغان افواج کی رہنمائی کرتے ہوئے کشمیر پہنچے جن کا سپہ سالار عبداللہ خان ایشک اقاصی تھا۔ کشمیری قائدین نے افغانوں کو نجات دہندہ سمجھ کر مغلوں سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے بلایا مگر بقول شاعر

ناگہاں چوں بلائے دامن گیر
شاہ اقاصی رسید در کشمیر

افغان بلحاظ مذہب تو مسلمان تھے مگر ان کے مظالم نے درندوں پر بھی خوف طاری کر دیا۔ افغانوں نے کشمیری خواتین پر بغیر اجازت کے شادی پر پابندی عائد کر دی یعنی اگر کوئی جوان لڑکی افغانوں کو پسند نہ آتی تو وہ کسی کشمیری سے شادی کر لیتی۔ افغان سپاہی کی تلوار ہمیشہ بے نیام رہتی اور ایک ایک سپاہی اپنی خدمت کے لیے کئی لونڈیاں اور غلام رکھتا۔ عام آدمی پر ٹیکسوں کا اس قدر بوجھ ڈالا گیا کہ لوگ بھوک سے مرنے لگے اور راتوں کو چھپ چھپ کر پنجاب کی طرف ہجرت کرتے۔ اس دور میں بڑی تعداد میں کشمیری پنجاب کے ضلع سیالکوٹ، گجرات، گجرانوالہ، جہلم اور کچھ بہار اور بنگال کی طرف چلے گئے۔ اس دور کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے افغان حکمرانوں کے ظلم وستم اور بربریت کی بدترین مثالوں کو قلم بند کیا اور اس 66 سالہ تاریک دور کو کشمیریوں کی مسلسل نسل کشی کا دور لکھا۔

افغانوں کے ظلم و بربریت کے 66 سال پورے ہوئے تو کشمیری قائدین کا تیسرا وفد اپنے آباؤ اجداد کا توشہ غیرت لیکر رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچا اور سکھوں کو دعوت تسخیر

دی۔ پریم ناتھ بزاز کے مطابق دہلی اور کابل جانے والے وفود اور سکھوں کے سامنے آزادی کا سودا کرنے والے وفد میں صرف اتنا فرق تھا کہ پہلے وفود مسلمان کشمیریوں پر مشتمل تھے جبکہ خالصہ دربار میں جو کشمیری وفد پہنچا اس میں ہندو پنڈت اور مسلمان کشمیری برابر شریک ہوئے۔ کشمیری قائدین کی دعوت پر سکھوں نے کشمیر پر حملہ کیا تو مقامی لوگوں نے سکھوں کی مدد سے افغانوں سے تو نجات حاصل کر لی مگر حکمرانوں کے ظلم وتشدد میں کوئی فرق نہ آیا۔ مشہور کشمیری مورخ محمد دین فوق کے مطابق افغان دور ایک تلخ گھونٹ تھا تو سکھ زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔ افغان عید شب برات منانے اور نماز روزے کی حد تک کشمیریوں کو مسلمان سمجھتے ہوئے چھوڑ دیتے مگر سکھوں نے مسجدوں کو اصطبلوں میں بدل دیا، مذہبی رسومات پر پابندی عائد کر دی اور خانقاہوں، درس گاہوں اور دیگر مذاہب کے عبادت خانوں کو قفل لگا دیئے۔ معمولی جرائم پر سرعام پھانسیاں دی جاتیں اور سزا پانے والوں کی لاشیں کئی کئی روز تک بازاروں میں لٹکی رہتیں۔ گاؤکشی پر پابندی عائد کر دی اور مسلمان کشمیریوں کو چمڑے کا جوتا پہننے سے منع کر دیا تاکہ لوگ ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں نہ جاسکیں۔ سکھ حکمرانی کے 27 سالہ دور میں کشمیری مغلوں اور افغانوں کے مظالم بھول گئے اور سکھوں سے نجات حاصل کرنے کا سوچنے لگے۔ اس سے قبل کے سکھ دور کا خاتمہ کسی بغاوت یا جدوجہد کی صورت میں ہوتا پنجاب میں سکھ عروج کو زوال نے دبوچ لیا۔ 1846ء میں انگریزوں نے سکھوں کو شکست دی اور تاوان جنگ میں کشمیر 75 لاکھ نانک شاہی کے عوض جموں کے مقامی راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ یوں ہزاروں سال کی خود مختاری غلامی کے 260 سال گزارنے کے بعد 75 لاکھ روپوں کے عوض بک کر ایک نئے دور میں داخل ہوگئی جو کہ غلامی ہی کی ایک نئی صنف تھی۔ ڈوگرہ راج جس کا دائرہ ایک صدی پر محیط ہے مقامی شخصی حکمرانی کی ایک بدترین مثال ہے۔ کشمیر پر ڈوگرہ حکمرانی کو برطانوی ہند کی

مکمل تائید وحمایت حاصل تھی چونکہ جب بھی کشمیریوں نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف آواز اٹھائی برطانوی ہند نے ڈوگروں کی حفاظت اور امداد کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال کر عوام کی آواز کو دبا دیا۔ ڈوگرے مقامی حکمران تھے مگر جبر واستبداد انہیں سکھوں، افغانوں اور مغلوں سے ورثے میں ملا تھا۔ ڈوگرہ راج اور اس سے قبل مغل اور افغان دور میں ایک واضح فرق یہ تھا کہ کشمیر پر مسلط گورنر مسلمان ہوتے تھے جو اپنی حکومتوں کو خوش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی تجوریاں بھرنے کی خاطر کشمیری عوام پر ظلم ڈھاتے۔ یہ گورنر چونکہ مقامی لوگ نہیں ہوتے تھے اس لئے ان کا عوام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ڈوگرہ راج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ حکمران مقامی تھے اور ان کا عوام سے بھی کسی نہ کسی صورت رابطہ رہتا مگر جبر وتشدد میں وہ اپنے پیش رو حکمرانوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔

1947ء میں تقسیم ہند کا وقت آیا تو اہلیان کشمیر کی امیدیں بھر آئیں مگر حسب سابق کشمیری قائدین کے وفود دہلی اور راولپنڈی کی طرف چل نکلے۔ اس سے قبل کہ وہ باہمی مشورے سے وقت اور حالات کے دھارے کا رخ اپنی جانب کرتے، انہوں نے سب کچھ دوسروں کے در پر رکھ دیا اور اپنی قسمت کا فیصلہ سیاست کے نیم حکیموں کی مرضی ومنشاء پر چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ قبل آزاد کشمیر کے پہلے صدر بیرسٹر سردار محمد ابراہیم خان (مرحوم) کا ایک بیان نظر سے گزرا جس میں موصوف نے فرمایا کہ 1947ء میں مجاہدین نے جو حکمت عملی اپنائی وہ غلط تھی۔ مجاہد فورس کے کمانڈروں نے اپنی ساری قوت مظفر آباد، اوڑی اور بارہ مولہ کی طرف لگا دی اور مجاہدین سرینگر پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ اگر اس وقت جنگی حکمت عملی کا درست تعین ہوتا تو بڑی قوت میرپور سے بھمبر اور پھر آگے جموں اور نوشہرہ کی طرف لگائی جاتی۔ اس مجاہد فورس کو جہلم، گجرات، سیالکوٹ سے لگاتار کمک ملتی اور مجاہدین آسانی سے جموں پر قبضہ کر لیتے۔ اس لمحے اگر بھارت میدان جنگ میں آدھمکتا تب

بھی مجاہدین بانہال پر آسانی سے قبضہ جمائے رکھتے اور نوشہرہ کے گردونواح کے علاقہ کو اپنے کنٹرول میں رکھنے میں کامیاب رہتے۔ بھارت کی جانب سے ممکنہ مداخلت کو آسانی سے روک کر قبائلی لشکر کو کسی بہتر منصوبہ بندی اور ریٹائیرڈ فوجی افسران کے زیر قیادت پونچھ، سرینگر اور بانہال کے شمال میں بھیجا جاتا تا کہ وہ مقامی کشمیری آبادی کو تکلیف پہنچائے بغیر ڈوگرہ افواج کو کنٹرول کرتے۔

حیرت کی بات ہے کہ سردار صاحب نے پچاس سال گزارنے کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کیا جبکہ ایک عام آدمی بھی کشمیر وار کونسل کی جنگی حکمت عملی کو دیکھ کر فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ کونسل عقل سے خالی لوگوں کا ایک جتھہ تھا جو محض خانہ پری کیلئے تشکیل دیا گیا جن کا کوئی بھی منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچا۔ سردار ابراہیم کے بیان سے منسوب وکٹوریہ سکوفیلڈ نے " کشمیر آن کراس فائیر" میں بڑی دلچسپ حقیقت کا انکشاف کیا ہے جسے پڑھنے کے بعد ایک عام قاری اس بات کا اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ تحریک کسی بھی طرح کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی تھی۔ وکٹوریہ کے مطابق سردار صاحب نے فرمایا کہ دوسری عالمی جنگ میں ریاست جموں وکشمیر کے 71666 لوگوں نے برٹش انڈین آرمی کی جانب سے حصہ لیا جن میں 60402 مسلمان فوجیوں کا تعلق میرپور اور پونچھ سے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت برادری ازم کی لعنت سے اہلیان کشمیر کے دل و دماغ بالکل پاک اور صاف تھے اور سردار صاحب کو سبھی لوگ اپنا قائد اور لیڈر مانتے تھے۔ برادری ازم کے جراثیم کئی سالوں بعد پنجاب کے نو دولتیے سیاسی گھرانوں نے بطور خاص آزاد کشمیر بھجوائے تا کہ کشمیریوں میں سادگی، باہم دوستی اور بھائی چارے کی فضا ختم ہوجائے اور وہ برادریوں کے نام پر ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوکر اپنے ازلی اور ابدی دشمن سے توجہ ہٹالیں۔ آزاد کشمیر جسے آزادی کا پلیٹ فارم بنا کر تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا منصوبہ بنتا، یہ پلیٹ فارم طوائف الملو کی

کی نظر ہوگیا۔ آزادی کی خاطر جانوں کے نذرانے پیش کرنے والوں کی جگہ کاغذی لیڈروں، پاؤنڈ مافیا اورٹن قائدین نے لے لی۔

شہزور خان، آغا جان، سردار شمس خان، سردار راج ولی خان، راجہ شیر خان، راجہ اکبر خان، کیپٹن بابر خان، کیپٹن حسین خان، لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان اور نائیک سیف علی جنجوعہ سے لے کرتا دم تحریر لاکھوں شہیدوں کی قربانیاں بھلادی گئیں اور کشمیری قوم کو آزادی کے ان متوالوں اور آزادی کی شمع روشن رکھنے کی خاطر اپنے خون کا عطیہ پیش کرنے والوں کے ناموں کی پہچان بھی نہ رہی۔

چیچنیا، بوسنیا، افغانستان، انگلینڈ، آئیر لینڈ حتیٰ کہ فرانس، روس اور امریکہ سمیت کسی بھی ملک میں چلے جائیں آپ کو وطن وقوم کی آزادی کے لئے قربانیاں دینے والوں کی یادگاریں اور کتبے جگہ جگہ نظر آئینگے۔ آپ جب ان ممالک میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے جو نام آپ کو پڑھنے کو ملتا ہے، جو مجسمہ آپ دیکھتے ہیں، جو دروازہ اور پل آپ پار کرتے ہیں، جس ائیر پورٹ اور بندرگاہ پر آپ اترتے ہیں وہ کسی نہ کسی ہیرو سے منسوب ہوتا ہے۔ کشمیر جو کہ تین سو دس سالوں سے غلام در غلام چلا آرہا ہے۔ جس کی سات نسلیں آزادی کی جنگ لڑ چکی ہیں۔ جس کے شہدأ کی تعداد لگ بھگ ایک کروڑ ہے میں آپ جب داخل ہوتے ہیں تو یہاں آپ کے استقبال کے لئے کوئی شہزور، شمس خان، حسین خان، راجہ شیر خان، مظفر خان، راجہ اکبر خان اور سیف علی جنجوعہ شہید نہیں ہوتا۔ آپ کو ان ناموں کی تختیاں، آزاد کشمیر کے تعلیمی نصاب میں ان کا ذکر یا ان سے منسوب کوئی بڑی یادگار نظر نہیں آتی۔ آپ اگر شہیدوں اور غازیوں کے چمنستان پونچھ میں داخل ہوں تو آپ کو مجاہد اوّل گیٹ سے جبکہ بھارتی اور ڈوگرہ فوج کا غرور توڑنے والے مجاہدوں کے دیس میر پور میں داخلے کے وقت باب سلطان سے گزرنا پڑتا ہے۔ باب سلطان پر اٹھنے والے اخراجات اور

مدت تعمیر بھی ایک تاریخی کارنامہ ہے جس کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ باب سلطان سے آگے قد آدم تصویروں کا ایک بازار نظر آتا ہے جن میں حالیہ اور سابقہ وزرائ، وزراء اعظم اور سیاسی لیڈروں کی تصویریں کیکروں کے جھنڈ میں بڑی شان سے سجائی گئی ہیں۔ ان سے آگے میر پور شہر (جسے منگلا ڈیم کی تعمیر کے بعد جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ہے) میں داخل ہونے سے پہلے بھٹو پارک اور بینظیر یونیورسٹی کی دیوار ہے جس کی کوئی بڑی وجہ نظر نہیں آتی۔ آپریشن جبرالٹر سے شملہ معاہدے تک کوئی بڑا واقع تاریخ میں نہیں جو اس تاریخی پارک اور کاغذی یونیورسٹی کی وجہ کی تشریح کرے۔ کوٹلی میں داخلے کے وقت کہیں نائیک سیف علی جنجوعہ نشان حیدر یا ہلال کشمیر کا کتبہ یا دروازہ بھی نظر نہیں آتا بلکہ جنگلوں میں سڑک کے کنارے کچھ چیڑ کے درختوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے تنوں پر کچھ وزرائ کی تصویریں ٹھونکی ہوئی ہیں جس سے حکومت کی کشمیر پالیسی اور تحریک آزادی کشمیر کے ٹھیکیداروں کی تشہیر کی ایک جھلک دکھلائی دیتی ہے۔ تحریک آزادی کشمیر سے سرکاری قیادت کا خلوص نہ صرف وزرائ کی شاہانہ زندگیوں سے جھلکتا ہے بلکہ ان کے کردار و گفتار سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ تحریک میں ان لوگوں کا کیا کردار ہے۔

کشمیر ڈیفنس کونسل کا منصوبہ دیکھ کر ایک عام قاری اس کے منصوبہ سازوں کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ سردار ابراہیم صاحب نے 2001ء کے اپنے اخباری انٹرویو میں اس منصوبے پر جو تنقید کی وہ نہ صرف حرف بہ حرف درست ہے بلکہ اس پر مزید بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے ماضی کی غلطیوں کو عام آدمی سے چھپائے رکھا، عوام الناس کو صرف ووٹ مشین کے طور پر استعمال کر کے چند شعبدہ بازوں کی تجوریاں بھرنے کا وسیلہ بنائے رکھا، قوم کو طبقوں اور برادریوں میں تقسیم کر کے انہیں اصل دشمن اور اس کی

چالوں سے بے خبر رکھا تو تحریک آزادی، تحریک غلامی میں بدل جائے گی اور موجودہ کشمیری نسل تقسیم شدہ غلامی کے اس دور سے غلامی کے چھٹے دور میں داخل ہو جائے گی۔

کشمیر ڈیفنس کونسل کس نے بنائی ؟اور جو لوگ اس میں شامل ہوئے ان کی کارکردگی اور تجربہ کاری کو پرکھنے کا کیا طریقہ تھا؟ ان کی منصوبہ بندی میں پاکستانی سیاسی اور فوج قیادت کس قدر ملوث تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ تاریخی حقائق کے مطابق گورنر جنرل قائداعظمؒ آپریشن "گلمرگ" سے بے خبر تھے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ مہاراجہ کشمیر نے تقسیم ہند کے فوراً بعد پاکستان کے ساتھ معاہدہ قائمہ کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ مہاراجہ کشمیر اپنی آزاد حیثیت بحال رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس سے قبل ریاست میں دکھلاوے کے ہی سہی مگر پارلیمانی انتخابات بھی ہو چکے تھے اور کسی نہ کسی صورت ایک اسمبلی اور پارلیمنٹ کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تقریباً پچاس سال گزرنے کے بعد مہاراجہ کے خیالات اور اصولی سیاسی موقف کو عملی جامہ پہنانے کی جو کوشش ہو رہی ہے اس پر کوئی دانشمند کشمیری قیادت اور آزادی کے نعرہ بازوں سے نہیں پوچھتا کہ اگر آپ نے پچاس سالوں بعد مہاراجہ کے خیالات سے ہی ہم آہنگ ہونا تھا تو لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مشہور کشمیری محقق اور مورخ محترم جی۔ ایم۔ میر کے مطابق کشمیری قوم پر گزشتہ چار صدیوں سے جتنی مصیبتیں آئیں سب ان کے لیڈروں کی لائی ہوئی تھیں۔ 1586ء میں مغل بادشاہ اکبر کو تسخیر کشمیر کی دعوت دینے والے کشمیری لیڈر تھے۔ 1757ء میں افغانوں کو کابل سے کشمیری لیڈر بلا لائے۔ 1818ء میں کشمیر قائدین سکھوں کو دعوت دینے لاہور پہنچے۔ 1947ء میں یہ لیڈر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور اپنی اپنی مرضی کے حملہ آور لے کر سرینگر اور مظفر آباد پہنچ گئے۔ سردار ابراہیم صاحب کے حملہ آور چونکہ متحد نہ تھے اور ان کا مقصد جہاد نہیں بلکہ لوٹ مار تھا اس لئے

ان کا جہاد کامیاب نہ ہوسکا جبکہ دہلی جانے والے اپنے حامیوں کو جہازوں میں بھر کر پوری طرح مسلح ہوکر آئے اور کامیاب ہوگئے۔

اس سے پہلے کہ آپریشن " گلمرگ " کا مختصراً جائزہ لیا جائے موجودہ کشمیری قیادت کے متعلق جناب جی۔ایم۔میر کا ایک تبصرہ نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "اسلام آباد اور راولپنڈی میں مقیم کشمیری قائدین کی ایک جماعت مکانوں کے کرائے اور ٹیلی فون کے بل حق الخدمت کے طور پر وصول کرتی رہتی ہے"۔اس سلسلے کے ایک کڑی چندسال پہلے کا ایک اخباری تبصرہ ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ "ممبران کشمیر کونسل شہزادوں کی سی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ان کو کڑوروں روپے بطور صوابدیدی فنڈ تو ملتے ہی ہیں جس کے علاوہ انہیں ایک پجاور جیپ بمعہ ڈرائیور اور پٹرول، گاڑی کیلئے فنڈ، کشمیر ہاؤس میں ایک عدد عالیشان کمرہ جس میں دنیا کی ہر سہولت میسر ہے، ٹی اے ڈی اے، آرام دہ دفتر جس میں کوئی کام نہیں ہوتا کے علاوہ اتنی سہولیات میسر ہیں کہ ان گل چھروں کے بدلے میں یہ لوگ کئی کشمیر قربان کر سکتے ہیں"۔کشمیر کونسل عیش وآرام اور کرپشن سے لبریز ادارہ ہے جو پاکستان کے ہر وزیر اور وزیر امور کشمیر اور صدر آزاد کشمیر کے لئے مہاراجہ جیسی سہولیات کا انتظام کرتا ہے۔

ذرا اندازہ کیجئے! جس قوم کے قائدین کی زندگیاں ایسی ہوں اور قوم ان مدہوش قائدین کی قیادت پر ہی راضی بہ رضا ہو تو اس کی تحریک کس طرح کامیاب ہوسکتی ہے۔کشمیر وار کونسل کی جنگی حکمت عملی پر بات کرنے سے پہلے محترم جی۔ایم۔میر صاحب کے بیان کی وضاحت کرتا چلوں کہ آزاد کشمیر کے سیاسی قائدین، وزراء، ممبران اسمبلی اور ممبران کشمیر کونسل کو ٹیلی فون بلوں اور مکانوں کے کرایوں کی اب ضرورت نہیں رہی۔اسلام آباد میں ان کی کئی کئی کوٹھیاں، بیرون ملک فلیٹس اور وسیع کاروبار ہیں جن کا کشمیر احتساب بیورو اور حکومت

پاکستان میں انصاف فراہم کرنے والے اداروں کے سوا ساری دنیا کو پتہ ہے۔ حکومت پاکستان ان جائیدادوں سے بے خبر بھی رہنا چاہتی ہے چونکہ اس سے بہت سے پاکستانی افسروں اور سیاستدانوں کا مفاد منسلک ہے۔ اس ساری کہانی کا نچوڑ یہ ہے کہ ہمیں ماضی کی غلطیوں، حال کی خود غرضیوں اور خود فہمیوں کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم یونہی طبقات میں بٹے رہے اور ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے رہے تو نہ ہمارا قومی وجود رہے گا اور نہ ہی یہ چند گز زمین کی حکومت بچے گی۔ اگر ہم نے اپنا قومی تشخص بچانا ہے تو وقت کی رفتار کا احساس کرتے ہوئے ہمیں نام نہاد قائدین اور فرضی آزادی کے ٹھیکیداروں کو بحیثیت قوم مسترد کرنا ہوگا ورنہ ہم کبھی بھی آزادی کی روشن صبح نہیں دیکھ سکیں گے۔ اگر ہمیں شہدأ کے خون سے وفا کرنی ہے اور ان کی قربانیوں کا پھل حاصل کرنا ہے تو ضروری ہے کہ اُس مقصد کی تکمیل کریں جس کے لئے ان لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

آپریشن گلمرگ

مسودے کی تیاری کے سلسلے میں راقم نے نکیال (فتح پور)، کوٹلی، کھوئیرٹہ اور گردونواح کے دیہاتوں میں جانے کا فیصلہ کیا تا کہ شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ (ہلال کشمیر) کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کی جاسکیں اور شہید کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے ان کی زندگی کا مکمل خاکہ ذہن نشین کرلیا جائے۔ نکیال کے دہیاتوں میں پھیلی آبادی میں مجھے کچھ ایسے مجاہدین سے ملنے کا موقع ملا جو نہ صرف نکیال، کوٹلی اور سرساوہ پنجیڑہ کے علاقوں میں ڈوگروں کے خلاف لڑتے رہے بلکہ یہ لوگ بعض مقامی کمانڈروں کے پیغامات لے کر کبھی پیدل اور کبھی گھوڑوں اور خچروں پر سوار پلندری، باغ اور مظفرآباد تک بھی جاتے رہے مگر ہر طرف خودغرضی اور بے اتفاقی دیکھ کر یہ لوگ اکثر مایوس لوٹتے۔

ان لوگوں کی کہانیاں سن کر میں نے اپنی تحریر کا کینوس بڑھا دیا اور ان عوامل کا جائزہ لینے لگا جن کی وجہ سے ہم جیتی ہوئی جنگ نہ صرف ہار گئے بلکہ اس ہار کو اپنا مقدر سمجھ کر اسے مزید پستیوں کی جانب لے جانے کی راہیں مسلسل ہموار کر رہے ہیں۔ جدوجہد آزادی کشمیر اپنے ابتدائی مراحل میں جس شکست وندامت سے دوچار ہوئی ایسے حالات میں خون کی قربانیاں اکثر رائیگاں جاتی ہیں اور مفاد پرست عناصر آزادی کی خاطر قربانیاں دینے والوں کی لاشوں پر اپنے اقتدار کے محل تعمیر کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کشمیر اور اس کی ناکامی کے

اسباب پر نظر ڈالیں تو یہ تحریک ایسے ہی حالات اور حادثات سے دوچار ہوئی جہاں خودغرضی اور مفاد پرستی کے سیاہ بادلوں نے اسے روشن صبح بننے سے پہلے ہی گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بدل دیا۔

کام اعلیٰ ہو یا ادنیٰ اسے شروع کرنے سے پہلے جو سوچ انسانی دماغ میں آتی ہے اور جس طریقے اور سلیقے سے کام کرنے والا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا خاکہ اپنے ذہن میں لاتا ہے اسے منصوبہ بندی کہا جاتا ہے۔ یہ منصوبہ بندی انسان ہی نہیں بلکہ دیگر ذی روح بھی کرتے ہیں۔ شیر اور چیتے باقائدہ منصوبہ بندی سے شکار کرتے ہیں اور اپنے سے کئی گنا بڑے جانوروں کو زیر کر لیتے ہیں۔ چونٹیاں موسم کی شدت سے قبل اپنی خوراک ذخیرہ کرتی ہیں اور اپنے لئے محفوظ راستوں کا چناؤ کرتی ہیں۔ منصوبہ بندی کے بغیر کوئی بھی کام مکمل نہیں ہوتا اور کامیابی سے پہلے ہی بے ترتیب ہو کر بکھر جاتا ہے۔ تحریک آزادی کشمیر کے اوّلین قائدین اور منصوبہ سازوں میں بہت سے نام آتے ہیں اور سبھی منصوبہ ساز اپنے اپنے منصوبوں کے حق میں بہت سے دلائل بھی دیتے ہیں مگر عام آدمی شائدان سے اس لیے متفق نہیں ہوسکتا چونکہ زمینی حقائق اور جنگی منصوبوں میں مکمل تضاد پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا منصوبہ جناب سردار محمد ابراہیم خان کا ہے اور بہت سے لوگ انہیں اس تحریک کا بانی بھی کہتے ہیں۔ سردار صاحب نے تو اپنی خودنوشت (کشمیر ساگا) جس کا مطلب کسی خاندان یا شخصیت کی تاریخ میں رونما ہونے والی کامیابیوں اور کامرانیوں کی داستان ہے میں جو واقعات قلمبند کئے ہیں اس میں کسی فوجی سطح کی منصوبہ بندی کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ سردار صاحب نے ابتدائی منصوبہ بندی کے لئے مری کے ایک ہوٹل کا انتخاب کیا اور جو ابتدائی منصوبہ انہوں نے ترتیب دیا اس میں پونچھ کے عوام اور بعض شخصیات سے رابطہ، توڑے دار بندوقوں کے لئے بارود اور سکے (Lead) کا حصول شامل تھا۔ یاد رہے کہ توڑے دار بندوقیں کوٹلی، نکیال،

باغ اور مظفر آباد میں کچھ مستری نسل در نسل بناتے تھے اور درہ آدم خیل کی طرح یہ لوگ اس فن کے ماہر تھے۔ ان توڑے دار بندوقوں میں LEAD یعنی سکے کے چھرے اور ہاتھ کا بنا ہوا بارود ڈالا جاتا اور پوٹاشیم سے آگ دیکر فائیر کیا جاتا۔ توڑے دار بندوق بھرنے میں وقت لگتا مگر یہ فائیر نہایت ہی کارگر ہوتا اور ایک برسٹ کی صورت میں سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر دس بارہ آدمیوں کے گروپ کو زخمی کر دیتا۔ اس بندوق کی کارکردگی اور رینج کا دارو مدار بارود کی کوالٹی پر تھا۔ یہ بارود بیکڑ کی لکڑی کے کوئلے، گندھک، گڑھ اور پوٹاشیم سے بنایا جاتا جبکہ چھرے LEAD کو عام طریقے سے آگ پر پگھلا کر بنائے جاتے۔ خاص بات یہ کہ یہ چھرے اور بارود بھی مقامی طور پر تیار ہوتا تھا اور آج کل بھی ہوتا ہے چونکہ پہاڑی علاقوں میں مکانوں کی تعمیر کے لئے پتھر توڑنے، شادی بیاہ اور دوسرے خوشی کے تہواروں پر پٹاخے اور میرج بم بنانے کے لئے بھی یہی بارود استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ سارا اسلحہ اور ایمونیشن آزاد کشمیر کے ہر گاؤں اور قصبے میں موجود تھا تو پھر مری بیٹھ کر اس کی تیاری اور دریا پار مہم کا کوئی جواز نہیں تھا۔

باغ، راولاکوٹ اور پلندری میں سردار صاحب کا اپنا قبیلہ موجود تھا اور اس وقت ان کے خلاف کوئی اپوزیشن بھی نہیں تھی۔ مری بیٹھنے کے بجائے وہ چاہتے تو پنجاب اور صوبہ سرحد کا دورہ کرتے۔ خان عبدالقیوم خان سے رابطہ کر کے بہتر کوالٹی کا اسلحہ اور ایمونیشن اکٹھا کرتے اور ان کے پاس جو ساٹھ ہزار ریٹائیرڈ فوجی موجود تھے انہیں مختلف یونٹوں میں تقسیم کرتے اور ایک باقائدہ فورس بنا کر کمانڈروں کو مری بلاتے اور انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے۔ اس سلسلہ میں وہ میرپور، کوٹلی اور بھمبر کے سابقہ فوجیوں سے بھی رابطہ کرتے اور اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے تا کہ ایک وسیع علاقے پر کم وقت میں قابض ہو کر اپنی عسکری اور سیاسی پوزیشن بہتر کر لیتے۔ مقامی کمانڈروں کی تعیناتی کے بعد ان لوگوں کے

ذریعے وہ سابقہ فوجیوں پر مشتمل دستے تیار کرتے اوران میں اسلحہ تقسیم کر کے انہیں مناسب موقع پر مسلح کاروائیوں کا حکم دیتے۔ اگر نکیال اور پنجن سے خچر سوار پیغام رسان دوسرے روز پلندری اور تیسرے روز مظفر آباد پہنچ سکتا تھا تو کوٹلی، میر پور اور بھمبر کو ایک سیکٹر بنا کر اور باغ، راولاکوٹ، پلندری، ہجیرہ اور پونچھ کو دوسرا اور مظفر آباد کو تیسرا سیکٹر بنا کر مقامی کمانڈ سسٹم کے ذریعے تحریک کو بہتر اور منظم طریقے سے چلایا جاسکتا تھا۔ اسی طرح قبائلی لشکریوں پر بھی مقامی کمانڈروں کا کنٹرول ہوتا اور وہ ان کے ماتحت یا پھر ان کی رہنمائی میں لڑتے تو جو لغزشیں قبائلیوں سے سرزد ہوئیں ان سے بچا جاسکتا تھا۔ سردار صاحب نے پاکستانی فوج کے مسلمان افسروں اور سیاسی قیادت سے بھی خاطر خواہ رابطہ نہیں کیا۔ خان آف قلات، نواب آف بہاولپور، نواب آف ٹانک سمیت درجنوں جاگیرداروں اور نوابوں کے پاس اپنی انفنٹری اور توپخانہ موجود تھا۔ اگر کشمیری لیڈر کسی منصوبہ بندی کے ساتھ ان سرداروں کے پاس جاتے تو ان میں سے کوئی نہ کوئی انہیں ایک دو فیلڈ گنیں، چند سو گولے، دو چار مشین گنیں اور دو تین سو رائفلیں دے دیتا۔ اگر نہ دیتا تو آج ہم ان لوگوں سے پوچھنے میں حق بجانب ہوتے۔ اسی طرح خان عبدالقیوم خان کے علاوہ لاہور، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ میں کئی متوسط گھرانے اور شخصیات موجود تھیں جن کا تعلق کشمیر سے تھا۔ ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو مالی مدد بھی کر سکتے تھے جس سے بہتر اسلحہ اور ایمونیشن خریدا جاسکتا تھا۔ سردار صاحب خوش قسمت لیڈر تھے کہ ان کے پاس اپنی ہی مٹی کے ساٹھ ہزار سے زیادہ تربیت یافتہ فوجی موجود تھے جو دوسری عالمی جنگ کے آزمودہ کار سپاہی تھے۔ اگر سردار صاحب ان کا بہتر استعمال کرتے تو قبائلی لشکریوں کی کشمیر میں ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ انہیں جموں کی طرف بھجوایا جاتا تو نتیجہ کچھ اور ہوتا۔

ادارہ مطالعہ کشمیر آزاد جموں و کشمیر یونیورسٹی مظفر آباد نے جناب ڈاکٹر محمد سرور

عباسی کی خودنوشت " تحریک پاکستان کے سیاسیات کشمیر پر اثرات " میں جن حالات اور واقعات کا ذکر ہے ان میں سردار ابراہیم صاحب کی خودنوشت کی نسبت منصوبہ بندی کا کچھ واضع عکس دکھائی دیتا ہے۔ عباسی صاحب کے مطابق سردار ابراہیم صاحب حالات کی سنگینی کے پیش نظر اپنے دوساتھیوں راجہ عبدالحمید آف مظفرآباد اور سلطان حسن علی خان کے ہمراہ پہلے لاہور اور پھر کوہ مری پہنچے۔ کوہ مری پہنچ کر سردار صاحب نے مسلم کانفرنس کے پونچھ سے تعلق رکھنے والے لیڈروں کا اجلاس بلایا اور آزادی کشمیر کا منصوبہ تیار کیا۔ مصنف کے مطابق ان اجلاسوں میں ہزارہ اور راولپنڈی کے سرکردہ اشخاص بھی آتے تھے۔ شرکاء پیر آف مکھڈ شریف کی کوٹھی میں جمع ہوتے اور تحریک آزادی کی منصوبہ بندی ہوتی۔ ان جلاسوں میں جن اہم شخصیات کی شمولیت کا ذکر ہے ان میں سردار عبدالقیوم خان، مولوی غلام حیدر آف جنڈالہ، کیپٹن حسین خان شہید کے علاوہ مری اور راولپنڈی کے کچھ اصحاب، کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر خان اللہ داد خان، مری کے نائب تحصیلدار راجہ سلطان مقصود کا بھی ذکر ہے۔

ڈاکٹر عباسی کے مطابق ہتھیار اور ایمونیشن تین سرکردہ کمانڈروں یعنی سردار عبدالقیوم خان، کیپٹن حسین خان شہید اور کیپٹن خان محمد خان میں تقسیم کر کے انہیں بتدریج باغ، راولاکوٹ اور پلندری سیکٹر کا کمانڈر مقرر کیا گیا اور تینوں کمانڈروں نے دس روز کے اندر اپنے علاقے فتح کر لئے۔ گو کہ کتابوں میں اس کا ذکر نہیں مگر بزرگ مجاہدین کے مطابق پلندری سے ڈوگرہ فوج خود ہی پسپا ہو گئی چونکہ آزاد پتن پر راجہ سخی دلیر نے شب خون مار کر قبضہ کر لیا تو ڈوگروں کے حوصلے پست ہو گئے۔ راجہ سخی دلیر نے سرساوہ، سنہسہ، کوٹلی، کھجورلہ، رٹہ اور ناڑ سے بہت سے سابقہ فوجیوں کو اکٹھا کیا اور اپنی مدد آپ کے تحت ان علاقوں میں ڈوگروں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ راجہ سخی دلیر خان برٹش ائیر فورس کے سابقہ چیف ٹیکنیشن تھے۔ وہ گوریلہ جنگ کے اصولوں پر کاروائی کرتے اور کمانڈو ایکشن کر کے دشمن کے سپلائی

ڈپواور کیمپوں پر حملہ آور ہوتے۔ جب سخی دلیر نے دریائے جہلم کا مغربی کنارہ غیر محفوظ بنا دیا تو ڈوگروں کیلیئے ان علاقوں بشمول پلندری اور بارل میں رہنا مشکل ہو گیا۔

راجہ سخی دلیر نے میر پور کے راجہ دلاور (بریگیڈیر دلاور) میجر راجہ افضل اور میجر راجہ عبدالرحمان سے رابطہ کیا اور پلندری کے سیکٹر کمانڈر خان محمد خان کو بھی میر پور آنے کی دعوت دی۔ خان صاحب کی فورس چونکہ تازہ دم تھی اور بہتر سمت سے حملہ کرنے کی پوزیشن میں تھی اس لئے میر پور چھاؤنی پر قبضہ آسان ہو گیا۔ اگرچہ میر پور میں محصور ڈوگرہ فوج کو جموں اور نوشہرہ سے کمک مل رہی تھی اور اس سلسلہ میں ڈوگرہ اور بھارتی افواج کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر بھر پور کوشش میں تھیں کہ کسی نہ کسی طرح میر پور پر قابض رہا جائے۔ مگر میر پور کی طرف جموں اور نوشہرہ سے جتنی بھی امداد بھیجی جاتی اسے مقامی مجاہدین نے بھمبر، سماہنی اور سراہ سے آگے نہیں جانے دیا بلکہ گھات لگا کر دشمن کو بھاری نقصان پہنچایا۔

سردار ابراہیم صاحب کے جنگی منصوبے پر بعض اصحاب کی رائے ہے کہ ان کا منصوبہ صرف پونچھ تک ہی محدود تھا جسے انہوں نے بطریق احسن مکمل کیا۔ اگر اس میں کچھ وسعت ہوتی تو جس طرح خان محمد خان صاحب نے میر پور کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا اور مقامی کمانڈروں سے مل کر میر پور کی فتح کو یقینی بنایا اسی طرح کیپٹن حسین کی شہادت کے بعد کوئی بھی مقامی کمانڈر راولاکوٹ سے آگے براستہ ہجیرہ نکیال اور کوٹلی کے مقامی کمانڈروں سے رابطہ کر کے اور سردار فتح محمد خان کریلوی سے ملکر مینڈھر کی جانب سے پونچھ شہر کو میر پور کی طرح آسانی سے فتح کر سکتا تھا۔

سردار عبدالقیوم خان بھی دھیر کوٹ اور باغ کے بعد براستہ سدھن گلی چکار کی مسلم آبادی سے رابطہ کر سکتے تھے اور جو قبائلی لشکر سرینگر کی جانب رواں دواں تھے ان کی بہتر رہنمائی کرتے ہوئے ان کی موجودگی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے مگر سردار صاحبان پلندری،

باغ اور راولاکوٹ کی فتح کے بعد آزاد حکومت کی تشکیل کی جانب زیادہ متوجہ ہوئے ورنہ کوئی بات نہ تھی کہ وہ فوجی دباؤ جاری رکھتے اور اپنے ابتدائی منصوبے کو حالات کے مطابق تبدیلی کر کے جنرل اکبر، میجر خورشید انور اور میجر محمد حسین سے مل کر تسخیر کشمیر کو ممکن بناتے۔

تاریخ تحریک آزادی کشمیر (انقلاب پونچھ 1947ء) کے مصنف سردار محمد گلزار حجازی نے سردست سردار عبدالقیوم خان اور چوہدری غلام عباس کو تحریک آزادی کے قائدین ماننے سے ہی انکار کیا ہے۔ان کی تصنیف ستمبر 1999ء میں شائع ہوئی جو کہ پہلی نظر ہی میں جناب ڈاکٹر محمد سرور عباسی کی نوشت جس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہوا کا جواب نظر آتی ہے۔ دونوں مورخ ہماری تاریخ کا اثاثہ ہیں اور اپنی اپنی جگہ اظہار خیال کا حق رکھتے ہوئے ہمارے لئے محترم ہیں۔ان دو مصنفین نے ہی نہیں بلکہ اس ضمن میں لکھنے والے سارے کشمیری مصنفین کی تحریروں میں تضاد ہے۔سردار گلزار حجازی سردار ابراہیم کے سرینگر سے فرار کو حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت سے تشبیہہ دیتے ہیں کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مکہ میں اپنی بیوی اور بیٹے کو چھوڑ کر دین کی سربلندی کے لئے ہجرت کی بالکل ویسے ہی 32 سالہ سردار ابراہیم اپنی بیوی اور بیٹے کو ڈوگروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر دین اور ملت کی حفاظت اور وطن کی آزادی کی خاطر سرینگر سے مظفرآباد تشریف لے آئے۔سردار حجازی کے مطابق سردار ابراہیم کے علاوہ اس دور میں کوئی دوسرا شخص اتنی اہلیت نہیں رکھتا تھا کہ وہ تحریک اور حکومت چلائے اس لئے سردار ابراہیم نے نہ چاہتے ہوئے صدارت کا عہدہ قبول کیا۔سردار صاحب کی تحریر تحریک آزادی کے کئی دلچسپ پہلوؤں کا مجموعہ ہے جس کا ذکر اور ثبوت کسی اور کتاب یا شخص کے پاس نہیں۔سردار صاحب نے سپریم وار کونسل کے چودہ ممبران کے نام لکھ کر اس وار کونسل کے منصوبے کو سمجھنے کی راہیں بالکل آسان کر دی ہیں۔عجیب بات یہ ہے کہ ان چودہ ممبران میں سے کسی ایک کا بھی تعلق آزاد کشمیر کے دیگر اضلاع سے نہیں تھا۔سردار

صاحب اگراپنی تحریر میں توازن کی خاطر چند نام میر پور، کوٹلی، بھمبر اور مظفر آباد سے بھی شامل کر لیتے تو منصوبہ بالکل واضح ہو جاتا جبکہ سردار ابراہیم صاحب نے کشمیر ساگا میں کسی جنگی منصوبے اور وار کونسل کے قیام اور اراکین کا ذکر نہیں کیا چونکہ وہ خود سردار شوکت حیات کی ڈیفنس کمیٹی کے ممبر تھے۔اس تحریر سے یہی مطلب اخذ ہوتا ہے کہ سردار ابراھیم خان کی تنظیم کشمیر وار کونسل نہیں بلکہ پونچھ وار کونسل تھی جو کیپٹن حسین خان کی شہادت کے ساتھ ہی بکھر گئی ۔سردار حجازی اپنی کتاب کے صفحہ 98 پر ناخوشگوار واقع کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ وار کونسل کا منصوبہ انتہائی خفیہ تھا جس کے مطابق کمانڈر انچیف جناب کیپٹن حسین خان کے حکم کے مطابق 8 اکتوبر 1947 ڈی ڈے مقرر ہوا تھا۔حکم کے مطابق فیلڈ کمانڈروں نے 8 اکتوبر کی رات بارہ بجے کے فوراً بعد سارے موجودہ آزاد کشمیر میں ڈوگرا فوج پر حملہ آور ہونا تھا مگر سردار عبدالقیوم خان نے اس منصوبے کو سبوتاژ کر دیا جس سے دشمن الرٹ ہو گیا اور مجاہدین کو مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوئے۔سردار صاحب نے 30 ستمبر کی رات دانستہ یا نادانستہ نیلا بٹ کی چوکی پر فائر کیا جہاں دو ڈوگرا اہلکار اور ان کا مسلمان انچارج حوالدار سردار یعقوب تعینات تھے۔سردار حجازی نے دانستہ یا نادانستہ لکھ کر ایسا تاثر دیا ہے جیسے سردار عبدالقیوم کوئی بے خبر آدمی تھے جن سے راہ چلتے بندوق چل گئی۔اگر ایسا ہوا تھا تو یہ دانستہ ہی تھا جس پر تحقیق کرنا ضروری ہے۔اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مجاہد اوّل ہی تحریک آزادی کی راہ میں پہلی رکاوٹ بنے اور پونچھ میں شہید ہونے والے 2194 شہیدوں کا خون ان کے سر ہے۔اہم بات یہ ہے کہ اگر مجاہد اوّل نے یہ کیا تھا تو وار کونسل نے انہیں پکڑ کر سزا کیوں نہ دی اور ان کا کورٹ مارشل کیوں نہ ہوا؟ آزادی کی تحریکوں میں اس طرح کی حرکت کرنے والوں کو میدان جنگ ہی میں سزا دی جاتی ہے جس کے درجنوں ثبوت تاریخ میں موجود ہیں۔

سردار حجازی کے مطابق کرنل خان محمد خان صاحب کو قائد تحریک سردار ابراہیم خان

نے میر پور اور کرنل شیر احمد خان کو کوٹلی کا کمانڈر مقرر کیا۔ سردار صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ کشمیر روائتی طور پر ایک قبائلی رسم و رواج کا حامل خطہ ہے اس لئے جہاں کسی شخص کی برادری یا قبیلہ نہ ہو وہاں پاؤں جمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ سردار عبدالقیوم خان کے مطابق کشمیر کا اولین المیہ ذہانت ہے۔ لوگ ہر کسی کو با آسانی لیڈر نہیں مانتے۔ کرنل خان محمد خان اور کرنل شیر کی کوٹلی اور میر پور میں کوئی برادری نہیں تھی اور نہ ہی علاقہ کے عوام ان سے واقفیت رکھتے تھے۔ بقول جنرل اکبر کے اس وقت سردار ابراہیم صاحب بھی اتنے مقبول نہیں تھے اور نہ ہی عام آدمی ان سے واقف تھا۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کے نامزد کمانڈروں نے میر پور اور کوٹلی از خود فتح کر لیے۔ اگر سردار صاحب نے میر پور اور کوٹلی کیلئے کمانڈر مقرر کئے تھے تو انہیں چاہیے تھا کہ مظفر آباد اور بھمبر کے لئے بھی کمانڈر مقرر کرتے۔ قبائلی لشکریوں کو کنٹرول کرنے کے لئے کمیٹی تشکیل دیتے اور پاکستان آرمی اور صاحبان اقتدار سے بھی رابطہ کرتے۔ سردار حجازی صاحب میجر راجہ افضل، میجر راجہ عبدالرحمٰن، راجہ اکبر خان، راجہ دلاور خان آف میر پور، کرنل راجہ محمود خان آف تھروچی، راجہ بڈھا خان آف سماہنی، راجہ رحم علی خان آف بڑوھ، لیفٹننٹ راجہ مظفر خان شہید آف پنجن ستارہ جرأت (دوبار) ذیلدار راجہ ولائت خان سفید پوش آف نرماہ، ذیلدار محمد خان جرال اور سردار فتح محمد خان کریلوی کو بالکل ہی بھول گئے۔

سردار حجازی کی تاریخ اور آزاد کشمیر رجمنٹ کی تاریخ جسے آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر نے شائع کیا ہے میں بھی واضح تضاد ہے۔ یہ تضاد ان واقعات کی حقیقت سے دوری کا بھی غماز ہے چونکہ ان کا حقیقت سے واسطہ نہیں۔ سردار حجازی کے مطابق سردار محمد ابراہیم خان نے ایک لشکر جرار دے کر جناب کرنل خان محمد خان کو میر پور فتح کرنے بھیجا جبکہ سرکاری تاریخ کے حصہ اول صفحہ 246 پر درج ہے کہ ماہ اکتوبر 1947ء میں کرنل خان اور حوالدار فقیر محمد

خان آف جنڈالی ضلع پونچھ جو کہ پونچھ بس سروس کے مالک تھے میر پور آئے اور بلاہ گالہ (موجودہ میر پور شہر) کے مقام پر گھات لگا کر ڈوگرہ فوج کی ڈاک سروس کے موٹر سائیکل سوار سے سٹین گن اور موٹر سائیکل چھین لیا۔

کرنل خان اور حوالدار فقیر محمد نے اس سٹین گن کی مدد سے گوبند پور کے پولیس سٹیشن پر چھاپہ مارا جہاں سے نو رائفلیں اور ایمونیشن ان کے ہاتھ لگا جس سے کرنل خان نے ایک والنٹیئر فورس تیار کی جو کہ بعد میں سدھن بریگیڈ بن گئی۔ حیرت کی بات ہے کہ دو آدمی پونچھ سے میر پور آتے ہیں جہاں ان کی کوئی جان پہچان نہیں۔ پھر ایکشن فلموں کی طرح وہ موٹر سائیکل اور سٹین گن چھین لیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک فورس ان کے گرد جمع ہو جاتی ہے جسے وہ سدھن بریگیڈ کا نام دیکر ایک بڑا اور قدیم شہر جو کہ ایک تربیت یافتہ فوج کی چھاؤنی بھی ہے پر چند دنوں کے اندر قبضہ بھی کر لیتے ہیں۔ سردار حجازی کی تحریر میں پونچھ شہر کے محاصرے اور ناکامی کا سرے سے ذکر ہی نہیں کہ جن لوگوں نے گیارہ دنوں میں پلندری، راولاکوٹ، باغ، ہجیرہ اور ملحقہ علاقے ڈوگرہ فوج سے آزاد کروا لیے وہ پونچھ جیسے محصور اور امداد سے محروم قصبے کو فتح کیوں نہ کر سکے۔ غیر جانبدار مبصرین اور مجاہدین کے مطابق کیپٹن حسین خان کی شہادت کے بعد سردار عبدالقیوم خان اور دیگر کمانڈروں میں اختلافات پیدا ہو گئے چونکہ ہر کمانڈر اپنے مفاد اور ذاتی تشہیر کی جنگ لڑنا اور ہیرو بننا چاہتا تھا۔ سردار عبدالقیوم کا تعلق باغ سے تھا اور وہ برٹش آرمی میں لانس نائیک تھے۔ سردار صاحب نے سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ کے محکمے میں نوکری کی تھی اور انہیں لڑاکا دستوں کی کمان کا بھی تجربہ نہ تھا۔ سردار عبدالقیوم کی اپنی برادری (ڈھونڈ راجپوت جو اب عباسی کہلاتے ہیں) اتنی بڑی نہ تھی کہ وہ سدھن بٹالین اور بریگیڈوں کی طرح کوئی ڈھونڈ فورس قائم کرتے اس لئے مجبوراً انہیں باغ کے نارمہ، ملدیال، تیزیال، سادات اور دیگر راجپوت قبیلوں کا سہارا

لینا پڑا۔کیپٹن حسین خان شہید کی طرح کرنل خان اور دیگر کمانڈر برٹش آرمی کے اعزازی کمیشنڈ افسر اور نان کمیشن افسر تھے جن کا جنگی تجربہ سردار عبدالقیوم خان سے بدرجہا بہتر تھا۔ سدھن قبیلے سے تعلق کی وجہ سے انہیں اپنے ہی قبیلے کے ریٹائیرڈ فوجی دستیاب تھے جس کی وجہ سے انہیں سدھن کمپنیاں، بٹالین اور بریگیڈ بنانے اور اپنی اپنی پسند کے عہدے تخلیق کرنے میں دشواری نہ ہوئی۔

سدھن آرمی کی نسبت سردار عبدالقیوم کی فوج کم تھی اس لئے انہیں مجاہد اوّل کے لقب پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔آزادکشمیر رجمنٹل سنٹر کی مرتب کردہ تاریخ میں سردار عبدالقیوم کو بھی ایک بٹالین کی قیادت کا اعزاز بخشا گیا ہے مگران کی فتوحات کا ذکر مختصر اور مشکوک انداز میں کیا گیا ہے۔دیگر مصنفین نے بھی مجاہد اوّل اور ان کی باغ بٹالین کا ذکر کیا ہے جو شیر کیمپ کے علاقے تک گئی جب وہاں کوئی ڈوگرہ فورس موجود نہ تھی۔اوڑی کی جانب قبائل نے پیش قدمی کی تو باغ بٹالین اور مجاہد اوّل پونچھ کا محاصرہ کرنے والی فورس میں شامل ہو گئے مگر سدھن کمانڈروں اور عہدیداروں نے انہیں ساتھ ملا کر کسی بڑے ایکشن کی منصوبہ بندی نہ کی۔ پونچھ کے محاصرے کے کچھ ہی روز بعد پاکستان آرمی کے کچھ افسر اور ایک مختصر فورس پونچھ محاذ پر جا پہنچی اور عملاً کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔لگتا ہے کہ مجاہد اوّل نے کمان کی تبدیلی اور پاک فوج کے جوانوں اور افسروں کی آمد کے بعد کا منظر اپنی مستقبل بینی سے بھانپ لیا اور محض ایک برائے نام بٹالین کے قیادت کو ریاست کی قیادت پر قربان کردیا۔

بعض تحریروں میں لکھا ہے کہ مجاہد اوّل اچانک محاذ جنگ سے چلے گئے اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کر دیا تا کہ مستقبل کے سیاسی محاذ پر وہ عظیم کامیابیاں سمیٹ سکیں۔مجاہد اوّل اصل میں سیاستدان ہی تھے سپاہی نہ تھے۔اگر وہ پونچھ کے حصار پر بیٹھے رہتے تو کرنل خان اور دیگر کی طرح کبھی ایم ایل اے اور وزیر بھی نہ بن پاتے اور ان کا مجاہد اوّل کا خطاب بھی

ان کے نام نہ آتا۔

پونچھ کا محاصرہ اور ناکامی مجاہدین پونچھ کے لئے ایک سانحہ نہ سہی مگر تحریک آزادی کشمیر کی ناکامی کا ایک اہم موڑ ہے۔ پونچھ پر یلغار نہ کرنا، جموں محاذ پر توجہ نہ دینا اور بارہ مولہ کے باہر بیٹھ کر سیاسی محاذ کھولنا اور گلگت و بلتستان میں برسر پیکار مجاہدین سے رابطہ نہ رکھنا ایسے سوالات ہیں جن کا کسی کے پاس جواب نہیں۔

انقلاب پونچھ کے مصنف کے خیالات و افکار سے پتہ چلتا ہے کہ اصل انقلاب پونچھ میں آیا اور پونچھ تک ہی محدود رہا۔ اسی طرح مصنفین پونچھ اور دیگر قلمکاروں نے جموں اور نوشہرہ سیکٹر کا ذکر کبھی سرسری انداز میں کیا یا پھر سرے سے کیا ہی نہیں۔ کسی بھی مصنف نے راجہ بڈھا خان آف سہانی، چوہدری رحم علی خان آف بڑھو کے علاوہ بھمبر، برنالہ اور کوٹ جمیل کے مجاہدین کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ ہی گجرات میں بسنے والے کشمیریوں کی قربانیوں کا ذکر کیا جو انہوں نے مناور پر حملے کے دوران پیش کیں۔

مناور (چھمب) پر مجاہدین کی یلغار اور ناکامی تاریخ آزادی کشمیر کا اہم اور منفرد واقع ہے جس کی وجہ سے مہاراجہ کشمیر اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے مسلم کش منصوبے کی قلعی کھل گئی اور لاکھوں مسلمان تہہ تیغ ہونے سے بچ گئے۔ بھمبر ہی کے مقام پر مجاہدین نے پہلا بھارتی جنگی جہاز مار گرایا اور پائلٹ اور معاون پائلٹ مجاہدین کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ میر پور کے بعد بھمبر گیریژن ڈوگرا افواج کا مضبوط گڑھ تھا جس کی تسخیر کے بغیر میر پور سے کیل تک سارا علاقہ پھر سے ڈوگرہ اور بھارتی دسترس میں آسکتا تھا۔ بھمبر گیریژن کی تسخیر تحریک آزادی کشمیر کا ایک اہم موڑ ہے مگر مصنفین پونچھ نے کبھی اسے اہمیت نہیں دی۔

تحریک آزادی کشمیر کو ناکام بنانے اور سیوک سنگھیوں کی جموں کیمپ میں مقیم تین لاکھ مسلمانوں جن میں عورتوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی کو گولیوں کا نشانہ بنوانے میں

الفرقان بریگیڈ کا اہم کردار ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ کسی کشمیری مصنف اور سیاستدان نے الفرقان بریگیڈ کے قیام اور سیالکوٹ جموں محاذ پر تعیناتی اور خاموش تماشائی کے کردار پر کچھ نہیں لکھا۔ کشمیر وار کونسل جس کے سربراہ سردار ابراہیم خان تھے یا دوسری وار کونسل جس کی قیادت سردار شوکت حیات کررہے تھے کے کسی رکن یا ممبر نے الفرقان بریگیڈ کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔

تاریخ تحریک آزادی کشمیر کی ایک اہم دستاویز لیفٹیننٹ کرنل حق مرزا مرحوم کی ڈائری ہے جو میدان جنگ میں ہی لکھی گئی۔ حق مرزا نے 1947ء سے 1950ء، 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں حصہ لیا اور 1965ء کی جنگ میں جبرالٹرفورس کا بھی حصہ رہے۔ حق مرزا کے تحریر اور مصنفین پونچھ اور دیگر میں بڑا فرق ہے۔ حق مرزا کے علاوہ کسی بھی مصنف اور کشمیریات پر تحقیق کرنے والے سکالر نے رام پیاری محل گجرات جہاں جنگ آزادی کشمیر کا پہلا فورسز ہیڈ کوارٹر معرض وجود میں آیا کا ذکر نہیں کیا۔ جنرل زمان کیانی، بریگیڈیئر حبیب الرحمٰن، میجر اکمل، میجر محمد حسین (سابقہ INA) کو بھی کچھ اس انداز سے درگزر کیا گیا تا کہ مفاد کا جہاد کرنے والوں کی اہمیت کم نہ ہو پائے۔ تحریک آزادی کشمیر کو ڈھائی اضلاع تک محدود رکھنے اور اسے انقلاب پونچھ کا نام دینے والوں نے جسطرح اس تحریک کی اہمیت اور مقاصد کو دھچکا لگایا اتنا ستم بھارتیوں نے بھی نہ کیا۔

پلندری اور راولاکوٹ کو ڈوگروں کے تسلط سے آزاد کروانے میں جو کردار کیپٹن حسین خان شہید نے ادا کیا اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کیپٹن حسین خان کی شہادت کے بعد ان کا کوئی جانشین اس عظیم مجاہد کے مشن کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا اور تولی پیر کی فتح کے بعد پونچھ کے محاصرے کو ہی آخری فتح تصور کرلیا گیا۔

میری ناقص تحقیق کے مطابق کرنل خان صاحب کی نہ تو سردار محمد ابراہیم خان اور نہ

ہی سردار عبدالقیوم خان سے بنتی تھی۔ وہ سخت طبیعت کے مالک تھے جنہوں نے پلندری میں اپنے طور پر کچھ ایکشن کئے اور وہاں سے فارغ ہو کر میر پور میں برسر پیکار مجاہدین کی دعوت پر اس علاقہ میں اپنے دوسو ساتھیوں کے ہمراہ آئے۔ میر پور میں ان کے بیشمار ساتھی موجود تھے جن کے ساتھ وہ عرصہ تک برطانوی فوج میں نوکری کرتے رہے۔ میر پور وارد ہونے کے بعد کٹھار، چوکھ، چہال اور علاقہ بینسی کے (وینس) راجپوتوں نے کرنل خان کی بھر پور مدد کی اور ان کے سدھن بریگیڈ کا حصہ بنے۔

سردار حجازی اور آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر کے شعبہ تاریخ نے اپنی اپنی تحقیق میں راجہ محمد اکبر خان جیسے مجاہد کا ذکر نہ کر کے اپنی تحقیق کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ راجہ صاحب کے متعلق کرشن دیو سیٹھی لکھتے ہیں کہ "ماضی بعید سے قطع نظر اگر گزشتہ صدی کا جائزہ لیا جائے تو کئی بڑی شخصیات کے نام فوراً ذہن میں آجاتے ہیں۔ ان ہی حضرات میں ایک نامی گرامی نام راجہ محمد اکبر خان کا ہے جنہوں نے شخصی راج اور تانا شاہی کے خلاف اور غریب اور دبے کچلے عوام کے حقوق کے طرف داری میں ساری عمر جہاد کیا اور ہمالیائی عزم واستقامت کے ساتھ تادم آخر اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔"

کرنل خان، راجہ محمد اکبر خان مرحوم جن کا انتقال 2 اکتوبر 1946ء کو ہو چکا تھا کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ دونوں نے عرصہ تک اکٹھے برطانوی فوج میں ملازمت کی اور وہ راجہ صاحب کے قدردانوں میں سے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تحریک آزادی کشمیر جذبہ حریت کی ایک بے مثال داستان ہے جسے بدقسمتی سے قیادت میسر نہ آسکی۔ جو لوگ قائد بن کر ابھرے ان میں سے کچھ مادیت کا شکار ہو گئے اور دیگر بے اتفاقی کے بھنور میں جکڑے گئے۔ ڈھائی اضلاع کی حکومت نے ڈھائی سو سالہ تحریک آزادی کو میدان جنگ سے اٹھا کر چند نام نہاد سیاستدانوں کے گھروں میں بند کر دیا۔ حیرت ہے کہ کروڑوں جانوں کا نذرانہ

دینے والے شہدأ کی قربانیوں کو یکسر بھول کر اپنی اپنی پسند کے بتوں کی پوجا کرنے والے دانشوروں نے حقیقت سے آنکھیں چرا کر سیاسی سراب کے پیچھے بھاگنے کو زندگی کا مقصد بنا لیا اور برسر اقتدار ٹولے کی تعریف و توصیف میں حقائق کے منافی کتابیں لکھ کر اسے روٹی روزی کا وسیلہ بنالیا۔

1947ء کی تحریک آزادی کشمیر کے پانچ معتبر منصوبے تا حال منظر عام پر آئے ہیں جن میں سردار ابراہیم صاحب کا منصوبہ جس کا سردار صاحب نے خود کبھی ذکر نہیں کیا۔ میجر خورشید انور کا منصوبہ " گلمرگ " جس کی وضاحت نہیں کی گئی، جنرل اکبر خان کا منصوبہ جس سے حکومت پاکستان متفق نہیں تھی اور جو نہایت ہی قابل عمل تھا، بریگیڈئر حبیب الرحمان اور جنرل زمان کیانی کا منصوبہ جسے رد کرنے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی اور سردار شوکت حیات کا منصوبہ جسے خوش فہمی کا منصوبہ کہنا بے جا نہ ہوگا قابل ذکر ہیں۔ پاکستان کی فوجی اور سیاسی قیادت قائداعظمؒ کے خیالات سے متفق نہیں تھی اور نہ ہی انہیں کشمیر سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قائداعظمؒ کے بعد حکومت پاکستان کی کوئی کشمیر پالیسی تھی ہی نہیں اور نہ ہی فوجی اور سیاسی قیادت کشمیر کے مستقبل اور اس کی پاکستان سے وابستہ حقیقت سے روشناس تھی۔ فوجی افسروں، جوانوں اور بعض سیاستدانوں نے ذاتی طور پر جو کچھ کیا وہ قابل صد تحسین ہے اور کشمیری قوم ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی مگر جس سوچ اور منصوبہ کا وقت اور حالات تقاضا کرتے تھے بدقسمتی سے اس کا مظاہرہ نہ ہوسکا۔ پاکستانی قائدین اور فوجی رہنما یہ بھول گئے کہ کشمیر پاکستان کی اقتصادی، معاشی اور دفاعی ضرورت ہے۔ ان تینوں پہلوؤں کی جنرل اکبر نے اپنی تحریر (ریڈرزان کشمیر) میں جامع انداز میں تشریح کی ہے۔ جس طرح جنرل اکبر خان نے پاکستانی قیادت کی غلطیوں سے پردہ اٹھایا ہے ویسے ہی کشمیری قائدین کو بھی اپنی غلطیاں تسلیم کرنی چاہیے اور ایک دوسرے پر الزامات

لگانے کے بجائے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ 1947ء میں تحریک آزادی جس جذبے اور قوت سے ابھری وہ صرف ناقص منصوبہ بندی، خود فہمی، لالچ، قوت ایمانی کی کمی، ڈر اور سب سے بڑھ کر رابطے کے فقدان کی نذر ہوگئی۔

بجائے اس کے کہ یہ لوگ اپنی غلطیوں کا احساس کرتے اور اصلاح کر کے آئندہ کے لئے بہتر لائحہ عمل تیار کرتے، کشمیری قائدین جدوجہد آزادی کے بجائے کرسی کے حصول کی جنگیں لڑنے لگے اور پاکستان کی طرف سے ملنے والی امداد کے علاوہ علاقائی وسائل تک کو ہڑپ کر گئے۔ اگر ان وسائل اور پاکستان کی طرف سے ملنے والی امداد کا نصف حصہ بھی آزاد کشمیر کی ترقی پر خرچ ہوتا تو آج آزاد کشمیر دنیا کا ایک مثالی خطہ ہوتا اور دوسری جانب کے لوگ مقبوضہ کشمیر کے نام نہاد قائدین کو مسترد کر کے خود ہی سیز فائیر لائن کو توڑ دیتے۔

مگر یہ نہ ہوسکا اور سیز فائیر لائن کنٹرول لائن میں بدل گئی چونکہ اس خونی لائن کے ہر دو جانب کے لیڈروں نے اپنے اپنے بت تراش لیے اور انہی کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔ سردار حجازی شائد سچ ہی کہتے ہیں کہ ان کے لیڈر کے علاوہ کوئی دوسرا اس قابل نہیں تھا کہ تحریک اور حکومت چلا سکے۔ آج ان لیڈروں نے حکومت اور سیاست کو اپنا خاندانی پیشہ بنالیا ہے اور ان کی دوسری اور تیسری نسل اس حق کی دعویدار ہے۔

شہید کشمیر کون ہے؟

شہید کشمیر کا ابتدائی مسودہ لے کر میں نائیک سیف علی جنجوعہ شہید (ہلال کشمیر) کے بیٹے اور بیگم سے ملنے ان کے گھر موضع کھنڈھاڑ (فتح پور) پہنچا تو اہل محلّہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ باتوں باتوں میں مجھے نہ صرف اپنی غلطیوں کا احساس ہوا بلکہ مجھے اپنی تحریر کو از سر نو ترتیب دینے کا خیال بھی آیا چونکہ شہید سیف علی جنجوعہ اُس تحریک کا ایک حصہ تھے جس کے لئے سردار شمس اور سردار سبز علی شہید کی کھالیں کھینچی گئیں۔ کرناہ کے راجہ شیر خان نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے اہل وعیال کو ذبح ہوتے دیکھا اور لاکھوں نوجوانوں نے اپنی جوانیوں کا نذرانہ پیش کر کے تحریک آزادی کشمیر کو چنگاری سے شعلہ بنایا۔ کھنڈھاڑ میں مختصر قیام کے دوران مجھے عمر رسیدہ خواتین وحضرات سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا جنہوں نے اپنی جوانی میں یہ سب کچھ دیکھا جسے میں لکھنے کی سعی کر رہا تھا۔

کھنڈھاڑ کے بزرگوں سے ملنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ میری تحقیق ادھوری ہے۔ مجھے اِن جیسے عام مگر تاریخی لوگوں سے ملنا چاہیے جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ جو اسمبلی کے ٹکٹ، نوکری کے لئے چِٹ اور غبن کے لئے کسی پرمٹ کے خواہاں نہیں۔ جن کی برادری اہلیان کشمیر ہیں اور جن کے جسم سے بلیک لیبل کی بدبو نہیں بلکہ مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ جو مجاہدین کی مرہم پٹی کرتے تھے، ان کا سامان سروں پر اٹھائے کبھی ایک پہاڑی سے دوسری

پہاڑی پر کبھی ایک وادی سے دوسری وادی میں اور کبھی کوسوں دور ایک سیکٹر سے دوسرے سیکٹر میں جاتے تھے۔ یہ لوگ تاریخ کا سچا باب ہیں۔ اِن کے ناموں کے ساتھ کوئی لقب نہیں، ان کے سینوں پر کوئی حکومتی تمغہ نہیں مگر ان کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن ہے۔ وہ کشمیر کی سرزمین اور کشمیری کے ذہن کو آزاد دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

اپنی ادھوری کوشش کو مکمل کرنے سے پہلے میں نے بازار میں دستیاب کتابوں اور کچھ محسنوں کی ذاتی لائبریریوں سے فیض یاب ہونے کی کوشش کی اور اپنی استطاعت کے مطابق بھمبر سے کیل تک ان جگہوں کو بھی دیکھا جہاں یہ معرکے لڑے گئے۔ اس مطالعے اور مشاہدے کا مقصد مجاہدین کی ہمت، حوصلے اور تکالیف کا جائزہ لینا تھا جنہوں نے نامساعد حالات میں ناممکن کو ممکن بنایا اور اپنی جانوں پر کھیل کر ہماری آزادی کی راہ متعین کی۔ میری اس کوشش میں دوچار نہیں بلکہ درجنوں خیالات کا اظہار موجود ہے جن کی سادگی اور سچائی ان کے چہروں پر عیاں تھی۔ کیری (چڑھوئی) اور تنگیری (کھوئٹہ) کے قریب جب میں ایسے ہی دو بزرگوں سے ان محاذوں پر ہونے والے معرکوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو دونوں بزرگ بار بار مجھے بتاتے کہ اس جگہ یہ ہوا یہاں ہم رات کو آتے اور اس طرف سے دشمن نے ہم پر حملہ کیا۔ ان سادہ لوح مگر سچائی کے پیکروں کی داستانیں سن کر میرا بہت سے مصنفین سے اعتبار اٹھ گیا۔ بہرحال کتاب ایک دستاویز ہوتی ہے اور جھوٹ پر مبنی تحریر بے اثر رہتی ہے۔

میں نے بہت سے لوگوں کی ذاتی ڈائیریاں بھی دیکھیں مگر یہ جان کر دکھ ہوا کہ یہ ڈائیریاں جن سے منسوب ہیں وہ شائد لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان عظیم لوگوں کی شہادت اور رحلت کے بعد بہت سے لوگوں نے ان سے اپنے تعلقات پر مبنی مفروضے گھڑے اور ان کی قبروں کو سیاست کے لئے استعمال کیا۔

محترم خالد حسن نے مرحوم کے ایچ خورشید کی تحریروں پر مبنی" قائد کی یادیں" ترتیب دی ہے۔اس کتاب کے شروع ہی میں کے ایچ خورشید سے منسوب ایک دلچسپ واقعہ درج ہے کہ مرحوم صدر ضیاء الحق نے ایک بار دعویٰ کیا کہ ان کے پاس قائداعظمؒ کی ایک ڈائری ہے اور قائداعظمؒ پارلیمانی جمہوریت کے خلاف تھے۔مرحوم صدر کو چونکہ پارلیمانی نظام پسند نہیں تھا اس لئے انہوں نے بھی شائد کسی رائیٹر کو قائداعظمؒ سے منسوب ایک ڈائیری تیار کرنے کا حکم جاری کیا ہو۔ضیاء الحق کے اس بیان کا جناب کے ایچ خورشید نے یہ کہہ کر بھانڈہ پھوڑ دیا کہ قائداعظم نے کبھی ڈائیری رکھی ہی نہیں تھی۔

کے ایچ خورشید کے اس بیان کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے کتابوں اور ڈائیریوں کو دیکھنے کے بعد آزاد کشمیر کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے جیتے جاگتے انسانوں سے ملنے کا فیصلہ کیا جنہوں نے نہ صرف اس تحریک کا مشاہدہ کیا بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس میں عملاً حصہ بھی لیا۔مسودہ (ہلال کشمیر) ترتیب دیکر میں نے اس کی کاپیاں 1999ء میں تب کے وزیر اعظم سلطان محمود چوہدری،صدر آزاد کشمیر سردار محمد ابراہیم خان،شہید کی یونٹ،آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر کے شعبہ تاریخ کے انچارج،ڈائیریکٹر جنرل انٹر سروسز پبلک ریلیشن ،جی ایچ کیو راولپنڈی،سابق سنٹر کمانڈنٹ جناب بریگیڈئیر ریٹائیرڈ محمد اکبر خان کے علاوہ آزاد کشمیر کے سیاسی قائدین اور اہل علم وقلم کو بھجوائیں مگر سوائے بریگیڈئیر محمد اکبر خان کے کسی نے بھی مجھے جواب نہ دیا۔

اس بات کا مجھے ہمیشہ ہی احساس رہتا ہے کہ اگر تحریک آزادی کشمیر تحریک تکمیل پاکستان ہے تو اسے کئی پہلوؤں سے نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے۔آزاد کشمیر کے عوام پر روا رکھی جانے والی بے انصافی سے پاکستان کا حکمران طبقہ منہ کیوں موڑ لیتا ہے اور نام نہاد قائدین کو پاکستانی حکمران اپنی خوشنودی اور مطلب براری کے لئے اہلیان کشمیر پر کیوں مسلط کرتے

ہیں۔ کشمیر اگر واقعی پاکستان کی شہ رگ ہے تو اس کے عوام کے حقوق مساوی کیوں نہیں؟ اگر سیف علی جنجوعہ شہید نشان حیدر ہے تو اس کے نام کے سامنے نشان حیدر کیوں نہیں لکھا جاتا؟ جو مراعات نشان حیدر پانے والوں کو دی گئی ہیں وہ سیف علی شہید کے خاندان کو دینے میں کیا حرج ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر جب نشان حیدر پانے والوں کی تصاویر دکھائی جاتی ہیں تو سیف علی شہید کو کیوں نہیں دکھایا جاتا۔ پاکستان میں بعض مقامات پر جہاں نشان حیدر پانے والوں کے پورٹریٹ نسب ہیں وہاں سیف علی شہید کے لئے جگہ کیوں نہیں۔ اگر میر پور میں بھٹو پارک بن سکتا ہے تو سیف علی شہید گیٹ تعمیر کرنے میں کیا شرمندگی ہے۔ چونکہ ان سوالات کا جواب پریس اور اہل قلم حضرات سے بہتر کوئی نہیں دے سکتا اس لئے میں نے پاکستان کے تمام موقر جریدوں کے مالکان، ایڈیٹروں اور چیف ایڈیٹروں کو بھی ہلال کشمیر کا مسودہ ارسال کیا مگر کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس پر ایک نظر ڈالتا اور اسے اپنے اخبار کے صفحات پر جگہ دیتا۔ البتہ آئی ایس پی آر نے مسودے کے کچھ حصے ہفت روزہ ہلال میں شائع کئے۔

اس سلسلہ میں راقم نے روزنامہ صحافت کے جناب خوشنود علی خان سے بات کی تو انہوں نے کچھ ایسا تاثر دیا جیسے وہ تحریک آزادی کشمیر کی ساری تاریخ سے بخوبی واقف ہیں۔ خوشنود علی خان نے مجھے اپنے ایک ایڈیٹر ہاشمی صاحب سے ملنے کو کہا۔ میں مسودہ لے کر ہاشمی صاحب کے دفتر پہنچا تو ایسے لگا جیسے ہاشمی صاحب اور اخبار کے دیگر کارندوں کی سیف علی شہید سے کوئی پرانی دشمنی تھی۔ اس اخبار سے منسلک بہت سے رپورٹروں نے مجھے گھیر لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ہر کوئی پوچھ رہا تھا کہ یہ نائیک سیف علی شہید کون ہے؟ کب اور کیوں شہید ہوا؟ اور یہ جھوٹا نشان حیدر کہاں سے آیا ہے؟ جب میں بہت سے سوالات کا جواب دے چکا تو ہاشمی صاحب نے ایک رپورٹر کو حکم دیا کہ وہ انڈسٹریل ایریا تھانہ کے

انچارج کو فون کرے تا کہ راقم کو پولیس کے حوالے کیا جائے۔ ابھی رپورٹر اپنی نشست سے اٹھنے ہی والا تھا کہ موصوف نے فرمایا مجھے بریگیڈئیر راشد قریشی سے ملاؤ چونکہ یہ فوج کا معاملہ ہے اور اس لڑکے نے ایک جھوٹے نشان حیدر پر کتابچہ لکھا ہوا ہے اس لئے اسے فوج کے حوالے کیا جائے۔ ابھی رپورٹر بریگیڈئیر راشد قریشی کا فون ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ راقم نے اس کا کام آسان کرنے کے لئے اسے محترم کرنل منصور رشید کا فون نمبر دیا تا کہ انہیں راشد قریشی کا نمبر مل جائے۔ کرنل منصور رشید کا نمبر لینے کے بعد ہاشمی صاحب کچھ بوکھلا گئے تو راقم نے فائل کور سے ہفت روزہ ہلال کی فوٹو کاپی نکال کر ان کے سامنے رکھی جو اسی مسودے کو مختصر کر کے ہلال نے شائع کی تھی۔

ہلال کی کاپی دیکھ کر ہاشمی صاحب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تو میں نے ان کے سامنے رکھی چائے کی پیالی اٹھالی جسے وہ غصے کے عالم میں پینا بھول گئے تھے۔ میں نے یہ ٹھنڈی چائے ہاشمی کی میزبانی کا تحفہ سمجھ کر پی اور واپس آ گیا۔ پریس کے اس رویے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستانی پریس اور دانشور کشمیر کے متعلق اتنا ہی جانتے ہیں، لکھتے ہیں اور بولتے ہیں جتنا انہیں معاوضہ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کشمیر کے متعلق منظر عام پر ہوتا ہے اندرون خانہ پہیہ اس کے الٹ چل رہا ہوتا ہے اگر جدوجہد آزادی کشمیر 1947ء کے سب سے بڑے ہیرو اور سب سے بڑا اعزاز پانے والے سے اہل پاکستان و آزاد کشمیر واقف ہی نہیں تو اس تحریک کی روح کا کسے احساس ہوسکتا ہے۔ روزنامہ صحافت کے صحافیوں سے ملنے کے بعد میں نے بارہا کوشش کی کہ کوئی دوسرا اخبار شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ ہلال کشمیر کے متعلق کچھ لکھے مگر مجھے کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

تحریک آزادی کشمیر کے متعلق جتنا بھی مواد کتابی صورت میں موجود ہے اس میں یکسانیت ہے۔ ہر لکھنے والے نے پنڈت کلہن اور محمد دین فوق کی شہرہ آفاق تحریروں کو ہی

اپنی اپنی پسند کے رنگ دے کر انہیں کتب خانوں کی زینت بنایا اور وہ لوگ جو تحریک آزادی 1947ء کے فوراً بعد خود ساختہ عہدوں اور رتبوں پر فائز ہوئے کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ آزادی کے وہ ہیرو جو بعد میں سیاست کے میدان میں آئے بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں جب کہ 1947ء کے واقعات اور آزادی کشمیر کے متعلق دو سو سے زیادہ کتابوں کے ڈھیر سے مجھے ایک بھی تحریر ایسی نہیں ملی جس میں اس جنگ میں سب سے بڑا اعزاز پانے والے ہیرو کا مختصر سا ذکر موجود ہو۔ آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر کے شعبہ تاریخ نے آزاد کشمیر رجمنٹ کی تاریخ جو کہ 1947ء سے 1949ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے میں بھی شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ کے لئے صرف ایک صفحہ مختص کیا گیا ہے۔ جس طرح تحریک آزادی کشمیر دنیا میں رونما ہونے والی آزادی کی تحریکوں میں کئی لحاظ سے منفرد ہے اسی طرح اس تحریک کے لئے مسلح جدوجہد کرنے والی آزاد کشمیر رجمنٹ بھی اعزاز یافتہ ہے۔ یہ رجمنٹ دو دو اور تین تین کے گروپ سے لے کر دس بارہ غیر مسلح لوگوں کی کاروائیوں سے شروع ہوئی جنہوں نے انوکھے انداز میں دشمن سے ہتھیار چھین کر مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ پھر یہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مل کر دشمن کے ٹینکوں اور جہازوں کا مقابلہ کرنے لگے اور آخر کار ایک باقاعدہ فوج میں بدل گئے۔

آزاد کشمیر رجمنٹ دنیا کی واحد فوج ہے جس نے پہلے جنگ لڑی اور بعد میں رجمنٹ بنی۔ امید ہے کہ آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر کا شعبہ تاریخ و تحقیق اس ضمن میں مزید اور بہتر مواد اکٹھا کر کے اپنی تاریخ کو بہتر انداز میں پیش کر سکے گا۔

یوں تو ہمارے سارے ہی شہید اور غازی معتبر ہیں اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس مادی دنیا میں جہاں انسان ایک پیسہ راہ خدا میں دینے سے پہلے سو مرتبہ نفع و نقصان کے متعلق سوچتا ہے اور شیطان قدم قدم پر اسے وسوسوں کے

جال میں پھنسانے کی جستجو میں لگا ہوتا ہے وہاں بغیر کسی نفع ونقصان کی سوچ کے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔ جس طرح انبیاء کرام اور اولیأ اللہ رب کائنات کے چنے ہوئے اور مخصوص لوگ ہیں ویسے ہی شہادت بھی کسی کسی کا مقدر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جن کی روشن صبح کے لئے ان لوگوں نے قربانیاں دیں انہیں ان قربانیوں کا کتنا احساس ہے اور وہ ان قربان ہونے والوں کو کس طرح یاد کرتے ہیں۔

یاد رہے کہ! جو قومیں اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھول جائیں اور ان کی متعین کردہ راہوں پر گامزن نہ رہ سکیں وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچتیں۔ ڈھائی اضلاع کی ریاست کے حکمران اگر یونہی مادی بتوں کی پوجا کرتے رہے اور جن لوگوں نے انہیں یہ ڈھائی گز زمین اپنا خون دے کر تفویض کی، انہیں قصہ ماضی سمجھ کر بھول گئے تو شائد کل یہ ڈھائی گز زمین بھی ان پر تنگ ہو جائے۔ آزاد کشمیر کی حکومتوں نے جس دریا دلی سے خیرات اور زکوٰۃ سے ملنے والی دولت خرچ کی ہے اور اپنے وزیروں، مشیروں اور ممبران پر خزانے لٹائے ہیں، اس سے لگتا ہی نہیں کہ یہ ایک غلام قوم ہے اور اس کے قائدین جدوجہد آزادی کا حصہ ہیں۔ تحریک آزادی کو جس طرح اس خطہ کے لیڈروں نے تاریک بنایا ہے اور اس جدوجہد کی خاطر خون دینے والوں کی عظمت کو داغدار کیا ہے، اگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ اور جاری رہا تو عین ممکن ہے کہ ہم اس نام نہاد آزادی کی نعمت سے بھی محروم ہو جائیں۔

مقصد بیان

میں نے اپنی تحریر کا تذکرہ جن لوگوں سے کیا ان میں سے بہت سوں کا خیال ہے کہ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید ہلال کشمیر پر نصف صدی بعد کچھ لکھنا بے مقصد ہے چونکہ اُسی دور میں تل پترہ پر شہید ہونے والے کیپٹن سرور شہید کو جب نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا تو آزاد حکومت کی وار کونسل اور ڈیفنس کمیٹی نے حکومت پاکستان سے تب کوئی مطالبہ نہیں کیا کہ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کو بھی نشان حیدر ہی دیا جائے۔ اب پچاس سالوں بعد حکومت پاکستان اس بات کو کیسے مان لے کہ ہلال کشمیر کو نشان حیدر کہا جائے جبکہ ہلال کشمیر کا تمغہ بھی موجود ہے جو شہید کے بیٹے نے وصول کر لیا ہے۔

کچھ فوجی حضرات کی رائے ہے کہ نائیک سیف علی شہید کا تعلق کسی باقاعدہ فوج سے نہیں تھا۔ گو کہ اس وقت حیدری بٹالین بن چکی تھی اور فوج سے کچھ افسر جن میں زیادہ تر ریٹائیرڈ جے۔سی۔اوز۔کو رینک دے کر لیفٹینینٹ، کیپٹن اور میجر بنایا گیا تھا، بھی موجود تھے مگر اس آزاد فوج کا حکومت پاکستان کی باقاعدہ فوج سے تعلق نہیں تھا۔ اس جنگ آزادی کے غازیوں اور شہیدوں کو جو اعزازات آزاد حکومت نے دیئے انہیں پچاس سال بعد حکومت پاکستان نے مساوی تسلیم کر کے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ان فوجی حضرات کا خیال ہے کہ ہلال کشمیر کو مساوی درجہ دینا ہی کافی ہے۔

کچھ دوستوں کا اعتراض ہے کہ ہلال کشمیر ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے مسلح

جدوجہد میں جان کا نذرانہ پیش کر کے ایک عظیم مرتبہ یعنی شہادت کا مقام حاصل کیا جب کہ یہ تحریر نائیک سیف علی کے معرکہ اور واقع شہادت کے علاوہ ایک سیاسی رنگ پیش کرتی ہے اور بہت سے سیاسی لیڈروں اور عسکری قائدین پر حرف تنقید اٹھاتی ہے۔

ان اعتراضات کو درست تسلیم کرتے ہوئے میں اپنے محترم معترضین سے ہی نہیں بلکہ اہل وطن سے گزارش کروں گا کہ تحریک آزادی کشمیر ڈھائی سو سال سے جاری ہے جب مغلوں کے جبر واستبداد کے خلاف وادی کشمیر کے نہتے لوگوں نے آواز اٹھائی۔ یہ تحریک اپنی جدوجہد کے پانچویں دور میں داخل ہو چکی ہے مگر اب تک کامیابی سے کوسوں دور ہے۔ آزادی کی تحریکیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتیں جب تک ان کی باقاعدہ منصوبہ بندی سے تشہیر نہ کی جائے اور جو لوگ ان عظیم تحریکوں کے لئے اپنی گردنیں کٹوائیں ان کی بے مثال قربانیوں سے بعد میں آنے والوں کو واقف نہ کروایا جائے۔ حق کے راستے پر قربان ہونے والوں کے قصے زندہ قوموں کے ایمان کو تازہ اور مضبوط کرتے ہیں اور جدوجہد آزادی کی شمع پر ایک نہیں بلکہ لاکھوں پروانے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے چلے آتے ہیں۔

شہید نائیک سیف علی جنجوعہ اس شمع کا وہ واحد پروانہ ہے جسے بغیر کسی سفارش اور پراپیگنڈہ کے ایک ایسا اعزاز دیا گیا جو کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ شہید نائیک سیف علی جنجوعہ کو تب ہلال کشمیر دیا گیا جب ان کا تعلق تحریک آزادی کے مجاہدین سے تھا نہ کہ پاکستان فوج سے۔ نائیک سیف علی کا اعزاز حکومت آزاد کشمیر نے دیا تھا چونکہ اس وقت حکومت پاکستان کا آزاد کشمیر میں کوئی واضح رول نہیں تھا۔ مگر آزاد حکومت جن اغراض و مقاصد کے پیش نظر قائم ہوئی تھی عملاً پچاس سال گزرنے کے باوجود وہ مقاصد حاصل نہیں کر سکی اور اس ناکامی کا سبب پاکستان اور آزاد کشمیر کے قائدین ہیں نہ کہ کشمیر کے عوام۔ جس مشن کی تکمیل کے لئے یہ عارضی حکومت اور آزاد کشمیر ریگولر فورس قائم کی گئی تھی اب وہ مشن اور رول بدل چکا

ہے۔آزاد کشمیر ریگولر فورس اب آزاد کشمیر رجمنٹ بن چکی ہے،سیز فائیر لائن کنٹرول لائن میں بدل گئی ہے اوراس سے بڑھ کر پاکستان میں موجود سیاسی پارٹیوں نے اپنی اپنی آزاد کشمیر شاخیں بنا کر مسلم کانفرنس کے سیاسی اور جہادی رول کو بھی ختم کر دیا ہے۔

ہمارے کچھ دانشور شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کا رونا تو روتے ہیں مگر انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ سے لیکر ایم کیو ایم تک جو پارٹیاں آزاد کشمیر میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور جس طرح ان پارٹیوں نے آزاد کشمیر کے عوام کو برادری ازم اور کرپشن کی بیماریوں میں مبتلا کیا ہوا ہے اس سے تحریک آزادی کو شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس سے کہیں بڑھ کر نقصان پہنچا ہے۔اگر آزاد کشمیر کی سیاست اور حکومت مساوی نہیں رہی تو نشان حیدر بھی مساوی نہیں بلکہ حقیقی ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟

اس حقیقت سے اب انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزاد کشمیر اب آزادی کا بیس کیمپ نہیں رہا بلکہ تحریک تکمیل پاکستان کا فارورڈ مورچہ بن گیا ہے۔موجودہ حالات میں پاکستانی قیادت کے لئے کسی آپشن کی گنجائش باقی نہیں رہی چونکہ بھارت اٹوٹ انگ کے بغیر بھی رہ سکتا ہے مگر پاکستان شہ رگ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔اس لئے پاکستانی قیادت کو اس بات کا جلد احساس کر لینا چاہیے کہ شہ رگ کو لگی بیماریوں کو دور کیا جائے اور انہیں ناسور بننے سے پہلے ہی ان کا علاج کیا جائے۔پاکستان کی اس شہ رگ کو سر دست برادری ازم، کرپشن اور نا انصافی کی بیماریاں لاحق ہیں جن کے جراثیم کچھ پاکستانی سیاستدانوں نے جان بوجھ کر اہل کشمیر کو لگائے ہیں۔اگر حکومت پاکستان نے ان مسائل کی طرف توجہ نہ دی تو 1947ء کی طرح مزید پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

صدر پاکستان نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ کشمیر پاکستانیوں کے خون میں شامل ہے مگر بے شمار پاکستانیوں، خاص کر سیاسی قیادت کو اس کا احساس نہیں۔اگر واقعی کشمیر ہر

پاکستانی کے خون میں شامل ہے تو پھر اس کے دو رنگ کیوں ہیں؟ پاکستانی قیادت کو چاہیے کہ وہ آزاد کشمیر کو سماجی برائیوں اور اخلاقی وسیاسی بیماریوں سے پاک کرے اور جن لوگوں نے یہ خطہ زمین آزاد کروایا انہیں مساوی نہیں بلکہ حقیقی تسلیم کرتے ہوئے ان کے قائد نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کو نشان حیدر عطا کر کے ان کی یادگار تعمیر کی جائے۔ ان کی برسی شایان شان طریقے سے منائی جائے اور ان کی یادگار پر پھول نچھاور کر کے نائیک سیف علی شہید سمیت ان لاکھوں شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا جائے جنہوں نے اپنی شہ رگ کٹوا کر پاکستان کی شہ رگ کی حفاظت کی۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تحریر سیاسی رنگ ومزاج رکھتی ہے میں ان کی تنقید کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی تحریکیں شخصیات سے نہیں بلکہ قومی سطح پر بیدار ہوتی ہیں جہاں برادریاں اور قبیلے ایک ملت اور ایک جسم کی مانند تحریکوں کو ایک متفقہ قیادت کی رہنمائی میں پائیہ تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔ آزادی کی تحریکیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتیں جب تک ان کے قائدین میں عسکری، سیاسی، سفارتی اور اخلاقی خوبیاں بدرجہ اتم موجود نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ زیرنظر تحریر محض ایک شخص کے ذاتی کارنامے تک محدود نہیں بلکہ ان عوامل کی تشہیر ہے جن کی وجہ سے یہ تحریک پائیہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ اس تحریر میں اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ تحریک کے بانی حضرات نے کن وجوہات اور کس کی آشیرباد پر اپنا عسکری رول ختم کر کے محض سیاسی رول پر اکتفا کیا اور ان قائدین کی صف میں کچھ ایسے بہروپیے بھی شامل ہوگئے جنہوں نے سیاست کے بدن سے اخلاق کا لباس اتار کر سیاست کو تجارت میں بدل دیا۔ کشمیر کا موجودہ المیہ نصف صدی پر محیط ہے اور ہم سب اس دائرے میں مقید ہیں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان عوامل کا ذکر بھی اس تحریر میں کروں تاکہ ہماری نئی نسل کو شہدأ کے خون سے کھلنے والے پھولوں کی خوشبو جب اپنی جانب

کھینچے تو انہیں اس راہ میں بکھرے کانٹوں کا بھی احساس رہے اور وہ قدم بہ قدم احتیاط سے چلتے ہوئے سیف علی شہید سمیت ان لاکھوں شہیدوں کے مشن کو مکمل کریں جو ہم سب پر فرض ہی نہیں بلکہ ہمارے سروں پر قرض بھی ہے۔

سیف علی ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے۔ یہ ایک جز ہے جو ملت کے قوی تر وجود کا حصہ ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ اس شخص کو، اس جسم کو اور اس تحریک کو ڈھائی صدیوں پر محیط خون کا نذرانہ دینے والوں کی صف میں لا کر سلام عقیدت پیش کیا جائے۔

خطبہ جلال و جمال

انسانی وجود مٹی کے خمیر سے بنا ہے جس کی کئی مثالیں قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ میں ملتی ہے۔ انسانی مساوات اور برابری کا بہترین درس نبی پاک ﷺ کے آخری خطبہ میں پنہاں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! یاد رکھو ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ یوں تو سبھی انسان بحیثیت اولادِ آدم برابر ہیں اور ان کی انسانی حیثیت میں کوئی فرق نہیں مگر تقویٰ، پرہیز گاری، تزکیہ نفس اور مجاہدہ ایسے اوصاف ہیں کہ کچھ انسان دیگر انسانوں کی صف سے نکل کر خدا کے برگزیدہ بندوں میں شمار ہو جاتے ہیں اور خدا کے یہی مخصوص اور برگزیدہ بندے نوع انسانی کی فلاح اور اصلاح کا بیڑہ اٹھائے ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انسان کے انہیں اوصاف کو جب فرشتوں نے سجدہ کیا تو شیطان نے بھی تا قیامت مہلت طلب کی تا کہ وہ انسان کے خمیر میں چھپی مادی قوتوں کو لالچ و ہوس میں مبتلا کر کے اسے حق کی راہ سے بہکائے۔

جس طرح انسان اپنے مادی وجود اور اس کی ظاہری ہیت کی بنا پر شیطان کی چالوں میں پھنس کر مادیت کے تابع اپنے سفلی جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے اور مادی نفع و نقصان اس کی ذات پر حاوی ہو کر اسے خالق کے راستے سے ہٹانے کا موجب بنتا ہے ویسے ہی خالق نے انسانی وجود میں ایسا خاصہ بھی رکھا ہے کہ وہ ہر مادی چال اور ہر شیطانی وسوسے پر اپنے خالق کی موجودگی اور اس کی قدرت کا احساس اپنے اندر خود بخود جاگزیں کرتا ہے۔ انسان کے وجود کی یہ خصوصیت یعنی ربّ کا خوف اس کی ہر لمحہ اور ہر جگہ موجودگی انسان میں

ایسی قوت بیدار کرتی ہے کہ وہ خالق کے سہارے، اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر چل کر اپنے لئے فلاح کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔

انسان کا وجود جس مٹی سے بنتا ہے اس کی مادی اور روحانی خاصیت کا اثر اس کی ذات پر ہوتا ہے۔ مٹی کی خوشبو اور کشش ہی انسان میں جذبہ حب الوطنی بیدار کرتی ہے اور وہ اس کی حرمت اور آزادی پر مر مٹنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میری اس تحریر کے ہیرو نائیک سیف علی شہید ہلال کشمیر کا وجود جس مٹی سے بنا اس کی خاصیت میں بھی قدرت نے کئی رعنائیاں بھر دیں تا کہ اس کے خمیر سے پیدا ہونے والے مرد مجاہد اس دلفریب و دلکش مٹی کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں۔

سابقہ تحصیل مینڈھر (نکیال) جس کا موجودہ نام تحریک آزادی کے نامور مجاہد سردار فتح محمد خان کریلوی کے نام پر فتح پور رکھا گیا ہے کا ایک گاؤں موضع کھنڈھاڑ ہے۔ علاقہ کھنڈھاڑ اور کریلہ کی خوشبودار اور رنگدار مٹی کی معدنی خصوصیات تو ایک حقیقت ہیں مگر اس مٹی سے پیدا ہونے والے مردان حق بھی بے مثل ہیں۔ ارضیاتی تحقیق کے مطابق کریلہ اور کنڈھاڑ کی رنگ برنگی مٹی جو زیادہ تر سیاہ و سرخ ہے میں قدرت نے لوہا، تانبہ، سرما اور گندھک جیسے قیمتی خزانے جمع کر رکھے ہیں۔ قدیم دور میں کھنڈھاڑ اور کریلہ میں دیسی طریقوں کے مطابق لوہا تیار کیا جاتا تھا جس کا رواج بعد کے دور میں ختم ہو گیا۔ قدرت کے ان چھپے خزانوں کا ذکر مشہور کشمیری مورخ محمد دین فوق نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف تاریخ اقوام پونچھ میں بھی کیا ہے۔

سرزمین کریلہ اور کھنڈھاڑ کے متعلق فوق کہتے ہیں کہ یہ مٹی اپنے وجود میں زرخیزی کا جو قوی مادہ رکھتی ہے اس کا اثر جا بجا نظر آتا ہے۔ اس علاقہ کے باشندے مضبوط، تندرست اور توانا ہیں اور اس مٹی میں شدت سے حسن خداداد بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں کی

مفلسی اور سادگی میں حسن کی بہار ہے جو اس قدر بسیار ہے کہ دامان نگاہ اسے سمیٹنے سے عاجز ہے۔

فوقؔ کی نگاہ ذوق نے اس مٹی کا ظاہری حسن دیکھا تو ان کے قلم نے نثر کو نغمہ سحر میں بدل دیا۔فوقؔ کو کیا خبر تھی کہ اس مٹی کا ایک باطنی حسن اور روحانی وجود بھی ہے جس کے جلال و جمال کو سائیں کملا، حضرت مائی طوطی اور سائیں فتو جیسے اولیائ کرام اور بندگان خدا نے عشق حقیقی کا بھی ایک رنگ دے رکھا ہے تا کہ آنے والے دور میں یہ مٹی اپنی ظاہری اور باطنی لطافت برقرار رکھے اور اس کے جلال و جمال میں شہیدوں کے خون کا رنگ شامل ہو کر اس کی عظمت کو دوبالا کر دے۔سرزمین فتح پور کے باطنی حسن و لطافت میں فقرأ کے زہد و تقویٰ کا اثر تھا کہ اس سرزمین سے تعلق رکھنے والے خدا کے منتخب بندے ظلم و جبر کے خلاف حق کی آواز پر اپنی جانوں کا نذرانہ لے کر میدان عمل میں کود پڑے تا کہ ان کا خون میناروں کی طرح بلند پیر نسوڑا، پیر کلیوا اور پیر بڈیسر کی سر بفلک چوٹیوں کے حسن بے مثال کو دوام بخشے اور آنے والے دور میں ان شاہینوں اور شہبازوں کی سرزمین میں پیدا ہونے والی غازیوں اور شہیدوں کی نسلیں تحریک آزادی کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔

کوہساروں کی سرزمین فتح پور (نکیال) چھوٹے بڑے چالیس دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ چار کونوں والا سبز ستارہ ہے جہاں سے چار سرسبز درختوں سے مزین پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں جن میں ایک سلسلہ پیر بڈیسر کی سمت نکلتا ہے جس کے دامن میں دلفریب وادی بناہ پناہ لیے ہوئے ہے۔

اس علاقہ میں تھکیال، ملک اور بھگیال راجپوتوں کے علاوہ پہاڑوں میں گوجر قبیلہ بھی بکثرت آباد ہے۔مستند تحقیق کے مطابق گوجروں کا شمار بھی راجپوت اقوام ہی میں ہوتا ہے مگر بوجوہ یہ لوگ اپنی علیحدہ حیثیت کے قائل ہیں جبکہ گوجروں کے عظیم دانشوروں اور

محققین نے اپنی زندگیاں اس تحقیق پر وقف کردیں اور یہ ثابت کرنے کے لئے تاریخ کی مستند کتابیں تالیف کیں۔

علاقہ مینڈھر (فتح پور) کی سرداریاں مختلف قبائل میں نسل در نسل تقسیم ہوتی رہیں ہیں مگر کئی صدیوں سے اس علاقہ میں تھکیال راجپوتوں کی حیثیت نمایاں رہی ہے۔ تاریخ کی کئی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تھکیالوں کا اصل وطن ایودھیہ تھا۔ ہندو دیومالائی تاریخ اور ہندو دھرم کی کتابوں اور عقائد کے مطابق تھکیالوں کا تعلق سورج بنسی قبائل سے ہے اس بنس کی ایک شاخ اگنی کل ہے جس سے نارمہ اور چوہان راجپوت نکلے ہیں۔

صدیوں پہلے تھکیال قوم کے کچھ سردار نقل مکانی کر کے میر پور اور بھمبر کے علاقہ میں آباد ہوئے اور اپنی لیاقت اور قوت کے بل بوتے پر بھمبر پر قابض ہو کر تھکیال قوم کی حکمرانی قائم کر لی۔ بعد کے دور میں چب راجپوتوں نے تھکیالوں کے ہاں پہلے پناہ حاصل کی اور جب تھکیال قوم کے مشاہیر کمزور ہوئے تو چبوں نے بھمبر پر قبضہ کر لیا۔ چبوں کے بھمبر پر قبضے اور تھکیالوں کے اخراج کی کئی دلچسپ داستانیں تاریخ میں نقل کی گئی ہیں۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ چب قوم کانگڑہ سے فتوحات کرتی بھمبر تک پہنچی اور سلسلہ کوہ کے دامن میں اس چھوٹی سی ریاست پر قابض ہوگئی۔ کچھ کے مطابق چب قوم کے سردار راجہ پرتاب چند نے شکست خوردہ ہو کر در بدر ہوتے ہوئے بھمبر کا رخ کیا اور تھکیالوں کے سردار راجہ سری پت سے پناہ کی درخواست کی جس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ سری پت نے اپنی اکلوتی بیٹی شہزادی تھکیالہ کی شادی اپنے مہمان کے بیٹے چب چند سے کی جس نے بعد میں تھکیالوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔

ایک اور مصنف کے مطابق چب چند نے تھکیال سرداروں کی دعوت کی اور طعام میں زہر ملا کر سب سرداروں کا خاتمہ کیا یا پھر جب سب سردار طعام گاہ میں پہنچے تو ان کا قتل

عام کر کے تھکیال حکومت کا خاتمہ کر دیا۔اس واقعہ کی تاریخ ابراہیم لودھی کے زمانہ کی ہے۔ تاریخ کے کچھ اوراق تھکیالوں کے سردار رستم دیو کی بہادری، شجاعت اور اولیأ کرام سے محبت اور عقیدت کے قصوں سے بھی مزین ہیں۔بھمبر سے زندہ نکل جانے والوں میں رستم دیو ایک جری اور بہادر جوان تھا۔رستم دیو نے موضع دھروٹی میں اپنا مسکن بنایا اور تھکیال قوم کو پراوہ، مینڈھر، بالاکوٹ اور سورن میں آباد کیا۔رستم دیو نے قبول اسلام کے بعد اپنا اسلامی نام رستم خان رکھا اور ان کا مزار دھروٹی ہی میں موجود ہے۔جس طرح چب قوم اپنے سردار چب چند (بابا شادی شہید) یعنی راجہ شاداب خان کی قبر پر حاضری دیتے ہیں اور بچوں کے بال ترشواتے ہیں ویسی ہی رُسم تھکیالوں میں بھی چلی اور یہ قبیلہ ایسی ہی رسومات رستم خان کے مزار پر ایک عرصہ تک ادا کرتا رہا ہے۔

تھکیال قوم فتح پور کے علاوہ راولپنڈی، گوجر خان، مری، ایبٹ آباد، باغ، مظفر آباد کے علاوہ مقبوضہ کشمیر کے علاقہ نوشہرہ، بھارت کے شہر ایودھیا، افغانستان کے سلسلہ کوہ بدخشاں، کنٹر اور سروبی میں بھی آباد ہے۔سابقہ تحصیل مینڈھر میں تھکیال اور ڈومال راجپوت حکمران حیثیت رکھتے تھے جن کے سالار سردار فتح محمد خان کریلوی نے تحریک آزادی کشمیر 1947ء میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے حیدری فورس قائم کی اور مینڈھر سمیت کئی علاقے ڈوگروں سے خالی کروالیے۔اس حیدری فورس کا ایک شیر دل کمانڈر، نائیک سیف علی جنجوعہ شہید ہلال کشمیر بھی ہے جس نے اپنی جان پر کھیل کر کوہساروں کی سرزمین پر دشمن کے ناپاک قدم جمنے نہ دیئے۔

سابقہ تحصیل مینڈھر میں جنجوعہ راجپوتوں کی آمد ویسے ہی ہے جس طرح تھکیال قوم اس علاقہ میں آباد ہوئی۔جنجوعوں کا قدیم مسکن ضلع جہلم ہے جہاں جنجوعہ اور گکھڑ راجپوت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے۔جنجوعہ قبائل نے گکھڑوں کی قوت سے تنگ آ کر ہمیشہ

بیرونی حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ تیمور جب جہلم کے علاقہ میں داخل ہوا تو جنجوعہ قبائل نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تیمور کی بھرپور مدد کی۔ اسی طرح بابر اور احمد شاہ ابدالی کو بھی گکھڑوں کی سرکوبی کے لئے جنجوعہ سرداروں نے قوت فراہم کی۔ گکھڑوں نے بھی جنجوعوں کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مختلف ادوار میں جنجوعہ قبائل نقل مکانی کر کے کشمیر کے مختلف علاقوں میں آباد ہوتے رہے۔ تاریخ اقوام پونچھ کے مطابق مینڈھر کے موضع پٹھانہ تیر میں غلام محمد آباد ہوئے۔ جنجوعوں کے لقب راجہ اور ملک ہیں جو حالیہ تحصیل فتح پور کے کچھ دیہات میں قلیل تعداد میں آباد ہیں۔ جنجوعوں کی چیدہ چیدہ رشتہ داریاں تھکیالوں، ڈمالوں، کلوتروں اور چبوں سے ہیں۔ کئی مقامات پر کم آبادی کی وجہ سے یہ قبیلہ دیگر مقامی قبیلوں میں مدغم ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی تاریخ کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ ہلال کشمیر کا تعلق بھی اس بہادر اور غیور قبیلے سے ہے جن کا آبائی پیشہ زمینداری تھا مگر بہت سے لوگ فن سپہ گری سے بھی منسلک تھے۔

نوٹ: چب اور ڈومال ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ چب چند جنکا اسلامی نام راجہ شاداب خان (بابا شادی شہید) ہے پرناب چند جنکا اسلامی نام دائمی یا دائم خان ہے کے بڑے بھائی تھے۔ تھکیالوں کی طرح ڈومالوں کے جد امجد کو بھی بھمبر سے ہجرت کرنا پڑی اور مجبوراً راجوری کے راجہ کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔ ڈوگرہ دور میں ڈومال قبیلے کے سرداروں کو تقویت ملی اور ان کی حیثیت میں اضافہ ہو گیا۔ سردار بلدیو سنگھ حاکم پونچھ نے ڈومالوں کی خدمات کے عوض راجہ اللہ داد خان ڈومال کو سردار کا خطاب دیا اور جاگیر عطا کی۔ ڈومال قوم حکمران ہونے کے باوجود بے علمی کی وجہ سے بھی مشہور تھی جس کا دکھ راجہ اللہ داد خان کے دل میں موجود تھا۔ آپ نے جاگیر عطا ہوتے ہی مسلمانوں کے لئے رفاعی کاموں کا سلسلہ شروع کیا۔ راجہ اللہ داد

خان جاگیردار نے اولیت تعلیم اور صحت کو دی اور جاگیر کی آمدنی سے اپنے ہی مکان میں سکول اور مطب کھول کر عوام کے لئے آسانیاں پیدا کر دیں۔ راجہ صاحب علم طب سے بھی واقف تھے اور اپنے ہی مطب میں مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ آپ سلسلہ قادریہ نوشاہیہ سے بیعت تھے اور روحانیت سے گہرا لگاؤ تھا۔ سردار اللہ داد خان اور ان کے بھائی سردار نوازش علی خان نقشبندی کی کوششوں سے حکومت کی جانب سے بہت سے ٹیکس معاف ہو گئے اور عوام علاقہ کو کافی ریلیف ملا۔

اپنے دادا کی طرح سردار فتح محمد خان بھی عوام دوست جذبہ رکھتے تھے اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ابتدأ میں آپ نے سٹیٹ پولیس میں بحیثیت سارجنٹ نوکری کی اور بعض وجوہات کی بنا پر نوکری چھوڑ کر عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ میر پور اور کوٹلی میں ڈوگرہ راج کے خلاف تحریک چلی تو آپ نے اس میں بھی حصہ لیا اور حکومت کی طرف سے آپ پر قتل کے تین مقدمات درج ہوئے مگر بعد میں یہ مقدمات ختم کر دیئے گئے۔ آپ انجمن تاجران و زمینداران پونچھ اور انجمن نوجوانان کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ کی کوششوں سے راجوری، کوٹلی اور مینڈھر کے عوام کو ٹیکس ریلیف ملا اور علاقہ بھر سے ٹیکس اور کسٹم چوکیاں ختم کر دی گئیں۔ سردار فتح محمد کی سیاسی قابلیت کی بنا پر انہیں پونچھ کی دو مسلمان نشستوں میں سے ایک پر جموں و کشمیر اسمبلی کے لئے چنا گیا تا کہ مہاراجہ کے دربار میں آپ دو لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کر سکیں۔

"بحوالہ تاریخ چیھال، راجپوت ذاتیں اور گوتیں، تاریخ اقوام پونچھ، تاریخ اقوام کشمیر، وادی کشمیر، جموں کشمیر کی پہاڑی ریاستیں مرتبہ فضل حسین شوق، لارڈز آف پنجاب، تاریخ جموں و کشمیر۔"

آخری کرن

موضع کھنڈ ھاڑ میں مختصر قیام اور شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ ہلال کشمیر کی بیوہ، بیٹوں اور دیگر عزیز رشتہ داروں کے خیالات سے فیض یاب ہونے کے علاوہ مجھے علاقہ کے بڑے بوڑھوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے اس تحریک میں بھر پور حصہ لیا اور معرکہ بڑا کھنا سمیت دیگر کئی معرکوں میں بھی شامل رہے۔ ان لوگوں کے خیالات اور ان کی زبانی واقعات سنتے وقت یوں محسوس ہوا جیسے میں خود پیر کلیوا کی پہاڑی پر کھڑا سیف علی جنجوعہ کو میدان جنگ میں لڑتے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر برق رفتاری سے دوڑتے اپنے جوانوں کو ہدایت دے رہے ہیں اور دشمن اپنی لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر جگہ جگہ پسپائی اختیار کر رہا ہے۔ وادیوں میں دشمن کے ٹینک اور فتح پور کی نیلگوں فضا میں دشمن کے ہوائی جہاز مجاہدین کے موروچوں پر آگ برسا رہے ہیں۔

میدان جنگ کی یہ فلم میرے ذہن میں چلتی رہی اور میں شہید کی بیوہ کی قدم بوسی کے بعد شہید کے کچے مکان کی دہلیز چھوڑ کر کوٹلی کی جانب چل دیا۔ فتح پور کی پہاڑی پر پہنچا تو سورج دریا کے پار سہنسہ کی پہاڑیوں کے اوٹ میں آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا جبکہ کوٹلی کی وادی پر سورج کی آخری سنہری کرنیں کیپٹن اظہار الحسن شہید ستارہ جرأت کو سلام عقیدت پیش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر اس بلند مقام پر کھڑا میں ہر سمت پھیلی سنہری کرنوں کو شہیدوں کے رنگ میں ڈھلتا دیکھتا رہا۔ اب کوٹلی کی وادی پر اندھیرا چھا رہا تھا اور فتح پور کی پہاڑیوں پر سبز چیڑ کے درختوں نے سیاہ لباس اوڑھ لیا تھا۔ میں صبح جب فتح پور کی جانب چلا تو پہلے اظہار

الحسن کی قبر پر حاضری دی۔ قبر کی گیلی مٹی سے عجیب خوشبو آ رہی تھی جو صرف کارگل کے شہیدوں کے خون سے آتی تھی۔ اب تو یہ خوشبو میرے خون، میرے ضمیر اور میری مٹی میں بس چکی ہے۔ ایک ماہ بعد اسی خوشبو میں معطر کیپٹن جاوید شہید بھی کارگل سے واپس آیا اور وطن کی مٹی پر ایک قبر کا اضافہ کر کے سورج کی ایک اور سنہری کرن کو اپنے خون کی سرخی میں بدل گیا۔

صبح جب میں اظہار الحسن کو سلام پیش کرنے گیا تو وہاں صرف دو آدمی موجود تھے۔ ایک عمر رسیدہ باپ قبر پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور بار بار اپنے اظہار الحسن سے پیار بھری باتیں کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوں رواں تھے اور ایک ہی فقرہ اس کی زبان پر آتا۔ بیٹا جی اللہ کے حوالے۔ اظہار الحسن کے سرہانے اس کا چھوٹا بھائی خاموش بیٹھا تھا۔ کبھی وہ اظہار کی قبر اور کبھی بوڑھے باپ کی طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے پر عجیب اداسی تھی۔ اس کے لبوں پر کئی سوال تھے جن کا جواب نہ تو کسی دانشور کے پاس ہے نہ کارگل کی جنگ کا منصوبہ بنانے والوں اور نہ ہی کشمیر کی پالیسی بنانے اور بگاڑنے والوں کے پاس۔ اس کے سوالوں کا جواب اس کا بھائی اپنے سینے میں لئے سامنے خاموش پڑا تھا۔

جو منظر میں صبح کوٹلی کے قبرستان میں دیکھ کر گیا تھا ویسا ہی منظر سیف علی شہید کے گھر میں بھی تھا۔ سیف علی کی بیوہ عمر رسیدہ ہو چکی تھی۔ بچے بھی اب جوانی کی حدود پار کر چکے تھے مگر جب محترمہ زہرہ بی بی نے اپنے شہید خاوند کی زندگی کے ایک ایک دن کی کہانی بیان کرنا شروع کی تو محمد صدیق اور محمد رفیق کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہوگئی۔ اظہار الحسن کے بھائی کی طرح دونوں بھائی بار بار ماں کے معصوم چہرے کی طرف دیکھتے اور آنکھیں بند کر لیتے۔ میرے دیکھتے ہی صدیق اور رفیق سالوں پر محیط اپنے ماضی میں چلے گئے۔ جب زہرہ بی بی نے بتایا کہ وہ مکئی کے کھیت میں فصل اکھٹی کر رہی تھی اور دونوں بچے ان

کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک مجاہد نے آ کر انہیں خبر دی کہ سیف علی شہید ہو گئے ہیں۔ زہرہ بی بی اچانک چپ ہو گئی اور پھر بولیں۔ صدیق اور رفیق خاموش رہے۔ میں نے کام چھوڑا اور دونوں کو اٹھا کر گھر چلی گئی۔ میرے پاس اور کچھ بھی تو نہیں تھا۔ میرا مالک کچھ دیر پہلے اس دھرتی کی رکھوالی کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔ میرے کھیتوں کی فصل کھیتوں میں بکھری پڑی تھی اور میری گود کی فصل میرے سامنے تھی۔ ہر طرف توپوں اور جہازوں کے گولے اور بم برس رہے تھے اور ہم عین میدان جنگ میں بے آسرا اور بے سہارا تھے۔

زہرہ بی بی کی مصیبتوں اور پریشانیوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسے بیان کرنے کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ عمر رسیدہ زہرہ بی بی اپنی داستان غم بیان کر رہی تھیں اور ان کے سامنے ایک ٹانگ سے معذور محمد صدیق جسے ایک حادثہ میں زخمی ہونے کی وجہ سے فوج سے ریٹائر کر دیا گیا اور درویش صفت رفیق بیٹھے تھے۔ میں زہرہ بی بی کی باتیں سن رہا تھا مگر میرا دل و دماغ نشان حیدر پانے والے دیگر شہدأ کے گھرانوں کی زندگیوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یوں تو دنیا کا دھن دولت کسی شہید کے خون کا نعم البدل نہیں اور نہ ہی ان عظیم لوگوں نے اپنی جان کا سودا کسی مادی خزانے اور صلے کی خاطر کیا مگر حکومت نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے ان کے خاندانوں کی جو دیکھ بھال کی کیا زہرہ بی بی اور ان کے بچے اس کے مستحق نہیں تھے؟ ایک طرف تو نشان حیدر پانے والوں کے بچوں کو حکومت نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم دلوائی بلکہ جو فوج میں آئے انہیں سینڈھرسٹ میں تربیت کے لئے بھی بھجوایا مگر کسی حکومت کو زہرہ بی بی کی غربت اور پریشانی کا خیال نہ آیا۔ کسی حکومت نے محمد صدیق اور تصویر بی بی کی تعلیم کا بندوبست نہ کیا اور نہ ہی بیمار محمد رفیق کے علاج کا کسی کو خیال آیا جبکہ اسی ملک کے وزیر مشیر اور حکومتی اہلکار اپنے زکام اور کھانسی کا علاج بھی امریکہ میں کرواتے ہیں اور معمولی گرمی لگ جائے تو دوسرے روز یورپ کی سرد سیاحت گاہوں میں پہنچ جاتے

ہیں۔ یہ المیہ آزادی کشمیر کا سب سے بڑا جنگی اعزاز پانے والے شہید کی بیوہ اور بچوں کا ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کا ہے جس نے اس ملک کی مٹی کے تقدس کے لئے قربانی دی اور غیرت ایمانی کا مظاہرہ کیا۔

زہرہ بی بی کی عظمت اور خودداری اس کے خاوند کے ہلال کشمیر سے بھی بڑا اعزاز ہے۔ زہرہ بی بی کی جرأت واستقلال کسی نشان حیدر کی محتاج نہیں۔ یہ زہرہ بی بی ایک عورت نہیں بلکہ ایک تحریک ہے جس کے بطن سے لاکھوں زہرہ بیبیاں پیدا ہوئیں اور کشمیر کے چپے چپے پر اپنی جوانیاں قربان کرنے والے لاکھوں صدیق، رفیق اور تصویریں آزادی کے سوداگروں اور سیاست کے مداریوں کی رنگ برنگی بولیوں اور قلابازیوں کا تماشہ دیکھ رہی ہیں۔ ان معصوم اور بے سہارا عورتوں اور بچوں کی سردار زہرہ بی بی ہے۔ جی ہاں! زہرہ بی بی نشان حرمت کشمیر بیوہ نائیک سیف علی شہید ہلال کشمیر۔ میں دل ہی دل میں تحریک آزادی کشمیر کے ان عظیم سپوتوں اور ان کے مصیبت زدہ اہل وعیال اور حکومت آزاد کشمیر کے کروڑ پتی وزیروں، مشیروں اور عوام کے دکھوں سے لاتعلق حکومتی اہلکاروں کے متعلق سوچتا کوٹلی کی حدود میں داخل ہوا تو پولیس نے ٹریفک روک دی۔ سامنے پجارو جیپوں کا قافلہ کوٹلی ریسٹ ہاؤس کی طرف جا رہا تھا چونکہ اس غلام دھرتی کا ایک آزاد منش ٹن وزیر چار ہفتوں کی یورپ یاترا کے بعد واپس آیا تھا۔ کل رات ہزاروں غریبوں نے اپنے ہیرو کیپٹن اظہار الحسن شہید ستارہ جرأت کو اس شہر کی مٹی کے سپرد کیا تھا۔ وہ بھی کئی ہفتوں تک کارگل کے بلند ترین محاذ جنگ پر دشمن سے لڑتے لڑتے شہادت کا جام نوش کر کے واپس آیا تھا۔ اظہار الحسن غریبوں اور غلاموں کا سردار تھا اور ان غریبوں اور غلاموں نے اسے مٹی کے سپرد کیا۔ آج امیروں، انسانی سمگلروں، منشیات فروشوں اور نودولتیوں کا سردار آرہا تھا اور اس کے ہم خیال اس کی آمد کا جشن منا رہے تھے۔ میرا دھیان بٹ گیا۔ ایک راستہ واپس فتح پور جاتا تھا

جہاں پیر کلیوا کی چوٹی پر سیف علی شہید کا جسم بکھرا پڑا تھا اور اسی پہاڑ کے دامن میں اس کی غریب بیوہ اور بچے اپنی سفید پوشی چھپائے پیر کلیوا کی جانب سے آنے والی ہواؤں میں سیف علی شہید کے خون کی خوشبو سے اپنے روح کو تسکین پہنچاتے تھے۔ دوسرا راستہ کوٹلی کے قبرستان کی طرف جاتا تھا جہاں کل کے سورج کی آخری کرن اظہار الحسن شہید کو سلام عقیدت پیش کرتی اس کے خون کی سرخی میں بدل گئی اور تیسرا راستہ کوٹلی ریسٹ ہاؤس کی جانب جاتا تھا جہاں قدم قدم پر پولیس کا پہرہ تھا۔ جہاں آج آزادی کے بیس کیمپ کے وزیر کا جام صحت تجویز ہونا تھا اور یورپ سے لائی گئی شراب کے جام چھلکنے تھے۔ تحریک آزادی کشمیر پر گرما گرم گفتگو ہونی تھی اور اخباری نمائندوں کو ان کا ایڈوانس مل چکا تھا۔ چونکہ کل صبح سورج کی پہلی کرن جب پیر بڈیسر کی اوٹ سے نمودار ہوگی تو ملک میں چھپنے والے ہر اخبار میں یہ سرخی نمایاں ہوگئی کہ "ملک کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے" کشمیر ہمارے دور حکومت میں آزاد ہوگا۔ "ہم نے کشمیر کو فلیش پوائنٹ بنایا ہے"

حصہ دوئم

ذکرِ شہید

یہ دنیا بنی نوع انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے جہاں ہر روز ہزاروں انسان پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔موت اور پیدائش کے اس نظام میں کچھ ساعتیں بڑی ہی مقدس اور مبارک ہوتی ہیں جب کچھ ایسے عظیم انسان پیدا ہوتے ہیں جو ظاہری موت کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں جس کی گواہی خود ربّ کائنات نے دی ہے۔انسان کی موت ہی اس کی پیدائش کی پہچان اور زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔کون کس کے گھر یا گھرانے میں پیدا ہوا،اس نے اپنی زندگی کس شان سے بسر کی،اس کی زندگی کے کارہائے نمایاں کیا تھے،وہ دیگر انسانوں کی فلاح واصلاح کے لئے کیا کرتا رہا،اس نے انسانوں کو دکھ دیئے یا ان کے دکھوں کا مداوا کیا ان سب سوالوں کا جواب انسانی زندگی کی معراج اور عظمت یعنی اس کی موت اور اختتام زندگی میں پنہاں ہے۔

زندہ رہنے اور زندگی کی لذت سے بھرپور لطف اندوز ہونے کی آرزو تو ہر کسی میں ہے مگر زندگی کو دوسروں کے لئے وقف کرنے اور شہادت کی موت کے آرزومند خال خال ہی نظر آتے ہیں۔زندگی کو ربّ کائنات کا تحفہ جان کر اسے دوسروں کے لئے وقف کرنے اور شہادت کی موت کے متلاشی ان بندگان خدا میں ایک نام سیف علی جنجوعہ شہید (ہلال کشمیر) کا بھی ہے جس نے اپنی ستائیس سالہ ظاہری زندگی کا ایک ایک لمحہ قدرت کی امانت سمجھ کر گزارا اور اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے ہوئے زندگی کو اس کی عظمت یعنی شہادت پر منتج کر دیا۔

آزادی کا چراغ شہید کے لہو سے روشن ہوتا ہے۔موت اور غربت کا فلسفہ سمجھ آجائے تو زندگی آسان ہوجاتی ہے۔سکھ بانٹو،دکھ نہ دو،مٹی سے پیار کرو ورنہ مٹی کی نفرت کی

بھینٹ چڑھ جاؤ گے۔ دعا کرو اللہ مجھے بھی شہادت نصیب کرے۔ یہ الفاظ عاشق رسول ﷺ نائیک سیف علی جنجوعہ کے ہیں جن کا اظہار وہ اپنی گفتگو میں اکثر کرتے اور اپنے علاقہ کے نوجوانوں کی عملی تربیت کرتے ہوئے انہیں جہاد کی طرف راغب کرتے۔

سیف علی شہید ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے جس کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے اور اس تاریخ کا ایک نیا باب ہر لمحے شہیدوں کے لہو سے لکھا جا رہا ہے۔ سیف علی شہید کی زندگی اور شہادت کے واقعات پر کوئی تحریری مواد موجود نہیں چونکہ سرکاری سطح پر حکومت آزاد کشمیر نے کبھی اس اعلیٰ ترین جنگی اعزاز کی تشہیر کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور نہ ہی حکومت پاکستان سے اس اعلیٰ ترین جنگی اعزاز پانے والے کے لواحقین کو مراعات دلوائیں۔ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید ہلال کشمیر کی بیوہ کو صرف وہی پنشن ملی جو ایک نائیک کی بیوہ کو ملتی ہے جبکہ نشان حیدر پانے والے شہدأ کے لواحقین کو بے شمار مراعات سے نوازا گیا۔

نائیک سیف علی جنجوعہ کے متعلق جو مواد موجود ہے اس میں "خلوص و ایثار یعنی مختصر تاریخ جہاد کشمیر" کے نام سے ایک کتابچہ لیفٹیننٹ محمد ایاز خان نے تحریر کیا جسے مرکزی جہاد کمیٹی ڈیرہ نواب صاحب نے شائع کیا۔

اس کتابچہ میں مصنف نے دیگر واقعات کے علاوہ شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ کے متعلق صرف اتنا لکھا کہ تحریک آزادی کشمیر 48-1947ء کا سب سے بڑا اور عظیم معرکہ نائیک سیف علی آف مینڈھر نے انجام دیا جس پر آزاد حکومت نے انہیں سب سے پہلا جنگی اعزاز ہلال کشمیر عطا کیا۔ نائیک سیف علی نے اپنی پلاٹون کی مختصر نفری سے دشمن کے ایک بریگیڈ کو روکے رکھا جسے توپخانے اور ہوائی جہازوں کی مدد حاصل تھی۔ نائیک سیف علی کی مدد کے لئے آفیسر کمانڈنگ کیپٹن رحمت علی خان پہنچے مگر اسی دوران دشمن کے ہوائی جہاز نے ایک بم پہاڑی پر گرایا جس سے ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ دھواں کم ہوا تو کیپٹن رحمت علی نے

دیکھا کہ یہ بم نائیک سیف علی کے عین اوپر گرا تھا جس سے ان کے جسم کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔

اس تحریر کے آخر میں لکھا ہے کہ شہید آزادی کی داستان جہاد، بعنوان "ہلال کشمیر" لکھ کر ڈیفنس سیکرٹری حکومت آزاد کشمیر کو بھجوائی تا کہ اس کی سرکاری طور پر اشاعت ہو سکے مگر افسوس کہ باوجود وعدے کے حکومت آزاد کشمیر نے اس تحریر کی اشاعت سے معذرت کر لی۔

اس سلسلہ کی دوسری تحریر آزاد کشمیر ڈیفنس کونسل کی میٹنگ نمبر 46 ہے جو 14 مارچ 1949ء کے دن سیکرٹری دفاع آزاد کشمیر کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں آزاد کشمیر کے وزیر دفاع، وزیر خزانہ، چیف آف سٹاف اور سیکرٹری دفاع نے شمولیت اختیار کی۔

میٹنگ کی کاروائی نمبر 258 میں لکھا گیا کہ ذاتی جرأت و دلیری کا مظاہرہ کرنے پر نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کو بعد از شہادت ہلال کشمیر کا اعزاز دیا جاتا ہے۔ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کا تعلق تحصیل مینڈھر کے گاؤں کھنڈھاڑ سے تھا۔ 26 اکتوبر 1948ء کو یہ دلیر اور نڈر کمانڈر ایک الگ تھلگ مقام پر اپنی پلاٹون کی کمان کر رہا تھا کہ دشمن کے ایک بریگیڈ نے جسے توپخانے، ہلکے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی بھرپور مدد حاصل تھی اس مقام پر حملہ کر دیا۔ دفاعی لحاظ سے اس اہم چوکی کے کمانڈر نائیک سیف علی جنجوعہ کی پلاٹون کا تعلق 18 آزاد کشمیر ریگولر فورس سے تھا جس کے ذمے پیر کلیوا کی پہاڑی کا دفاع تھا۔

نائیک سیف علی جنجوعہ شہید نے کمال جرأت، دلیری اور استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اس مقام کا بھرپور دفاع کیا بلکہ دشمن پر کاری ضرب لگا کر ان کا بے پناہ جانی و مالی نقصان بھی کیا جس کی وجہ سے دشمن کو کئی بار اپنی حکمت عملی بدلنا پڑی۔

دشمن کے بار بار حملوں کو پسپا کرتے ہوئے یہ نڈر اور بے خوف لیڈر آخر کار دشمن

کے توپخانے کی زد میں آ گیا اور توپ کا گولہ عین ان کے سر پر آ گرا جس سے ان کا جسم لاکھوں ٹکڑوں میں بکھر ا گیا۔

آزاد کشمیر ڈیفنس کونسل کے اس اجلاس کی کاروائی کو بھی کیپٹن رحمت علی خان سے منسوب کیا گیا ہے۔اس کاروائی اور لیفٹینینٹ ایاز خان کی تحریر میں صرف یہ فرق ہے کہ وجہ شہادت ہوائی جہاز کے بجائے توپ کا گولہ تحریر کیا گیا ہے۔

اس دور کی ایک اور حکومتی کاروائی میں 1947ء کی جنگ آزادی کے شہیدوں اور غازیوں کو ملنے والے اعزازات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔جس میں سرفہرست ہلال کشمیر مساوی نشان حیدر (I) کا ذکر ہے۔شہید کی یونٹ کی جانب سے ہونے والی خط و کتابت اور سنٹر کمانڈنٹ جناب بریگیڈیئر محمد اکبر خان کی کاوشیں لائق صد تحسین تو ہیں ہی مگر اس کے علاوہ شہید کے نواسے محمد ریاض ملک نے ایک پرچہ کی صورت میں شہید کے متعلق مختصر تحریر لکھی جو کہ قابل داد ہے۔

نائیک سیف علی جنجوعہ شہید ہلال کشمیر کے متعلق ایک دلچسپ تحریر آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے اجلاس کی کاروائی ہے جو 4 نومبر 1985ء بروز سوموار بوقت 9 بجے مظفر آباد میں منعقد ہوا۔اس اجلاس کی کاروائی اس لحاظ سے اہم تحریری دستاویز ہے کہ یہ ایک ایسی حکومت کے ایوان میں پیش کی گئی جو اپنے آپ کو آزادی کا بیس کیمپ تصور کرتی ہے اور جوان شہیدوں کے خون کے صلے میں معرض وجود میں آئی جنہیں بھول جانا اور ان کے خون سے بے وفائی کرنا ان حکومتوں کا اوّلین فرض بن گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آزادی کے بیس کیمپ میں پیش کی جانے والی اس قرارداد کا متن پیش کروں، قارئین کی توجہ آزاد حکومت کی شاہ خرچیوں اور عیش و عشرت کی جانب مبذول کروانا ضروری سمجھتا ہوں۔پیپلز پارٹی کی حکومت کے دور میں اسلام آباد پولیس نے

آزاد کشمیر کی ایک سرکاری گاڑی سے اعلیٰ قسم کی شراب کی لاتعداد بوتلیں ضبط کیں تو کشمیر ہاؤس سے آزاد حکومت کے اعلیٰ حکام نے اسلام آباد پولیس سے رابطہ کیا کہ شراب کی بوتلیں بہ حفاظت کشمیر ہاؤس بھجوائی جائیں چونکہ ہمارے کچھ یورپی مہمان آنے والے ہیں جن کے سامنے ہم نے مسئلہ کشمیر اور بوتلیں رکھنی ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر 13 اکتوبر 1999ء کی اشاعت میں "روزنامہ نوائے وقت" لاہور نے کیا جسے اسی روزنامہ کی 14 اکتوبر کی اشاعت میں دوبارہ خصوصی جگہ دی گئی۔ اس سلسلہ کی چند خصوصی تحریریں روزنامہ پاکستان اسلام آباد 26 فروری 2000ء بعنوان چھوٹی عدالت سے بڑی عدالت تک، روزنامہ خبریں لاہور کی توجہ طلب تحریر منیر احمد، بعنوان: آزاد کشمیر کے شراب کلچر کا ذمہ دار کون، روزنامہ نوائے وقت 5 ستمبر 1999ء تحریر رشید ملک، 18 اگست 1999ء کا روزنامہ صحافت اسلام آباد اور ظہیر احمد بابر کی سدا بہار نوشت پارلیمنٹ سے بازار حسن تک کے صفحہ نمبر 266 سے 280 تک قابل شرمندگی وندامت ہیں۔

ان تحریروں اور واقعات کے پڑھنے اور سننے کے بعد اندازہ ہوسکتا ہے کہ آزادی کے بیس کیمپ جسے آزاد کشمیر کے سیاستدانوں اور آزادی کے قائدین نے عیاشی کا اڈہ بنا رکھا ہے کسی صورت آزادی کی منزل نہیں پا سکتا چونکہ اخلاقی لحاظ سے پست اور شہدأ کے خون سے غداری کے مرتکب حکمران کبھی قوموں کی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ سورۃ نور میں فرمان الٰہی ہے کہ "تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا"۔

ریاست کے متعلق احادیث میں منقول ہے کہ دین اسلام اور حکومت دو جڑواں بھائی ہیں اور دونوں میں کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔ اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور

جس کا نگہبان نہ ہو وہ کھنڈر بن جاتی ہے۔تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتیں معروف اور بعض منکر ہونگی۔جس نے ان منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ناپسند کیا وہ بچ گیا اور جوان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوا۔قرآن اور احادیث کے اس اصول اور ضابطے کے مطابق کشمیری قوم خصوصاً اہلیان آزاد کشمیر اگر برادری ازم اور علاقائیت کا چوغہ اتار کر بحیثیت قوم اور مسلمان اپنا مواخذہ کریں تو شاید چند درجن ایسے مردوزن ہوں جو حکومتی برائیوں اور شہیدوں کے خون سے غداری کے جرم سے بچے ہوئے ہوں یا پھر بری الذمہ ہوں ورنہ ہم سب ماخوذ ہیں اور آزادی ہمارا قدرتی، فطری، دینی اور روحانی حق نہیں۔جس قوم کے قائد شراب کی بوتلوں، بدکار عورتوں، کرپشن کی دولت، گاڑیوں اور پلاٹوں کی تقسیم پر لڑتے ہوں اور قوم ان کی پشت پناہ اور قوت بازو ہو اسے کبھی آزادی اور عزت کی منزل نہیں ملتی۔

❖ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ "جو لوگ اللہ کے قوانین کے مطابق حکمرانی نہیں کرتے وہ لوگ بدکار ہیں پھر فرمایا تم پر جہاد فرض کردیا گیا ہے خواہ وہ تمہارے لئے بار خاطر ہی ہو۔وہ حکمران اور لیڈر جنہیں اللہ بدکردار کہتا ہے وہ جہاد کا نعرہ لگا کر ایک قوم کو آزادی کی نوید سناتے ہیں تو قوم اسے سچ مان کر اس کی امید لگا لیتی ہے تو اس سے بڑھ کر مدہوشی اور خود فریبی کیا ہوسکتی ہے۔ضروری ہے کہ ہم خود احتسابی کا عمل شروع کریں ورنہ آنے والے دور میں نہ صرف ہم غلامی کی دلدل میں مزید دھنس جائیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ ہمارا وجود بحیثیت قوم اس صفحہ ہستی سے ہی مٹ جائے۔

خود احتسابی اور توجہ کا پہلا درجہ حقیقت اور سچائی کو تسلیم کرنا اور خود فریبی کے چنگل سے نکلنا ہے۔جو قومیں اور قائد خود احتسابی سے فرار اور خود فریبی کی پناہ میں فلاح ڈھونڈتے ہیں ان قوموں اور قائدین کا حشر وہی ہوتا ہے جو کچھ عرصہ قبل جنین، رملہ اور بیت اللحم میں

فلسطینیوں کا ہوا ہے۔

فلسطین کے ارد گرد دنیا کی بائیس امیر ترین مسلمان ریاستیں موجود ہیں اور صرف سعودی عرب ہی اسرائیل کے بعد واحد ملک ہے جس کے پاس دنیا کا جدید ترین اسلحہ و ہتھیار موجود ہیں مگر ان میں سے کسی ملک میں ہمت نہیں کہ وہ فلسطین میں ذبح ہوتے بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور گولیوں سے چھلنی ہوتے غیر مسلح نوجوانوں کو اسرائیل کے پنجہ ظلم سے بچا سکیں۔ آج ہمارے بہت سے خوش فہم قائدین کا خیال ہے کہ وہ یورپ کے دوروں اور یورپ میں مقیم مزدوروں سے جمع کردہ رقوم سے یورپ میں کشمیر کمیٹیاں بنا کر کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت کر رہے ہیں مگر حقیقت میں یہ لوگ اپنے لئے پناہ گائیں اور عیش و عشرت کے مقام تعمیر کر رہے ہیں۔ انہیں بھارت اور دیگر اسلام دشمن قوتوں سے بڑھ کر اپنے من کا خوف پریشان کیئے رکھتا ہے جس سے بچنے کے لئے یہ لوگ دن رات تگ و دو میں مصروف ہیں۔

غور کا مقام ہے کہ اگر یورپ میں بننے والی القدس کمیٹیاں، یورپی یونین کی زبانی حمائت، روس اور بھارت کو دیئے جانے یاسر عرفات کے پیغامات اسرائیلی ٹینکوں، گن شب ہیلی کا پٹروں اور بلڈوزروں کا راستہ نہیں روک سکے تو وہ دن دور نہیں کہ افغانستان، عراق، لیبیا اور شام کے بعد پاکستان کا اس سے بھی برا حشر ہو اور عوام امن کی آشا کے شیدائی حکمرانوں سے اُمیدیں لگائے برائے نام آزادی سے بھی محروم ہو جائیں۔ آج کشمیر کی حالت فلسطین سے بھی بدتر ہے اور اسرائیل کشمیریوں کی نسل کشی میں بھارت کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ اسرائیل کا دوست بھارت یہی مشق آزاد کشمیر میں دہرائے گا اور ٹن حکمران اپنی بوتلیں اُٹھا کر یورپ اور امریکہ چلے جائینگے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہمارے قائدین جس نوجوان نسل کو عیش و عشرت، برادری ازم اور خود غرضی کا درس دے رہے ہیں جہاں ضلعے

تحصیل اور نیابت کا بغض ناسور بن رہا ہے۔ جہاں ہر سیاسی لیڈر نے ایک قبضہ گروپ تشکیل دے رکھا ہے اور حکومت اس کی پشت پناہی کرتی ہے۔ جہاں برادریوں کے نام پر چندہ جمع کر کے دہشت گردی کے لئے اسلحہ خریدا جاتا ہے۔ جہاں عدالتیں بے بس اور مجرم باوقار ہیں اس قوم میں کرنل حق مرزا جیسے غازی اور نائیک سیف علی جنجوعہ جیسے شہید پیدا نہیں ہو سکتے جو دشمن پر یلغار سے پہلے اسے تیاری کا پیغام بھجوائیں اور مٹھی بھر ساتھیوں کی مدد سے دشمن کے بریگیڈ پر حملہ کر دیں۔

اس سے پہلے کہ بات لمبی ہو جائے آیئے اس قرارداد کی طرف ایک نظر ڈالیں جو کئی عشروں بعد آزادی کے بیس کیمپ آزاد کشمیر کی اسمبلی میں پیش کی گئی۔

اسمبلی کے مذکورہ اجلاس میں ملک محمد یوسف (ایم ایل اے) نے وزیر انتظامیہ حکومت آزاد کشمیر سے دریافت کیا کہ شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ کو آزاد حکومت نے اپنا سب سے بڑا جنگی اعزاز ہلال کشمیر عطا کیا جو پاکستان کے سب سے بڑے جنگی اعزاز نشان حیدر کے مساوی ہے تو کیا شہید کی بیوہ کو دیگر شہدأ کی طرح مراعات بھی ملتی ہیں۔

اس پر وزیر موصوف نے جواب دیا کہ شہید کی بیوہ کو صرف وہی پنشن ملتی ہے جو دیگر شہیدوں کے پسماندگان کو دی جاتی ہے اور اس میں وقتاً فوقتاً مہنگائی کی وجہ سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بجائے شہید کے اسمبلی کی کاروائی میں لکھا گیا ہے کہ "مرحوم کے اس اعزاز کی وجہ سے پنشن میں کسی قسم کا اضافہ تحت قواعد ممکن نہیں۔"

اے کاش! کوئی باجرأت انسان آزاد کشمیر اسمبلی میں بیٹھے آزادی کے ان علمبرداروں اور قوم کے غم گساروں سے پوچھے کہ کشمیر ہاؤس پر کروڑوں روپے خرچ کرنے، سرکاری فنڈ ہضم کرنے، اقربا پروری اور کرپشن کو تحفظ دینے کے قوانین تو آپ نے بنا لئے مگر نائیک سیف علی شہید کی بیوہ کے لئے چند روپے مہیا کرنا اس اسمبلی کے بس میں نہیں۔

اس اسمبلی نے کشمیر کا الحاق تو پاکستان سے کر دیا مگر حکومت پاکستان سے ہلال کشمیر کے بجائے نشان حیدر لکھوانا ممکن نہ ہوا۔ اس اسمبلی نے سرکاری عمرے، حج اور مفت علاج کروانے کا اہتمام تو کر لیا اور ممبران کی مراعات اور عیش وعشرت کے بل تو پاس کر دیئے مگر تحریک آزادی کو زندہ رکھنے والوں کی کسمپرسی اور بدحالی کی طرف ایک نظر نہ دیکھا۔ ذرا سوچئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ اس کوالیفکیشن کے ساتھ ہم آزادی کے حقدار ہیں یا عذاب الٰہی کے؟ جس کا ایک منظر جنین اور رملہ سے اٹھنے والے شعلے پیش کر چکے ہیں۔

قارئین محترم:۔

نائیک سیف علی جنجوعہ شہید ہلال کشمیر کے متعلق جو قلمی مواد مجھے دستیاب ہوا اسے دیکھنے، پرکھنے اور حکومت آزاد کشمیر کا اس سلسلہ میں احساس ذمہ داری کا تجزیہ کرنے کے بعد جو سطور شہید کی زندگی کے متعلق قلمبند کر رہا ہوں اس کے راوی شہید کے لواحقین ہیں جن میں سرفہرست شہید کی بیوہ محترمہ زہرہ بی بی اور بیٹا جناب ملک محمد رفیق جنجوعہ ہیں۔

پیدائش وخاندان

نائیک سیف علی جنجوعہ 25 اپریل 1922ء کو موضع کھنڈ ہاڑ سابق تحصیل مینڈھر (کشمیر) حال تحصیل فتح پور (نکیال) کے ایک راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد معصوم خان کا شمار موضع کھنڈ ہاڑ کے معززین میں ہوتا تھا۔ آپ کا گھرانہ علم و فضل اور دینداری کی وجہ سے مشہور تھا۔ خاندان کا آبائی پیشہ زمینداری تھا جبکہ کچھ لوگ کشمیر اور برطانوی ہند کی افواج میں ملازم بھی تھے۔ سیف علی جنجوعہ کی والدہ کا تعلق راجپوتوں کے ایسے گھرانے سے تھا کہ جس کا سردار مہاراجہ کشمیر کی پنچائیت کا رکن تھا اس لئے اس گھرانے کو ملک کا خطاب ملا۔ آج بھی یہ لوگ اپنے نام کے ساتھ ملک لکھتے ہیں جو کہ ان کے علم و فضل اور منصف صفت ہونے کا امتیازی نشان ہے۔

نائیک سیف علی شہید کے جد امجد کا شجرہ کشمیر کے غیور، بہادر اور نڈر راجپوت گھرانوں سے ملتا ہے جنہوں نے ہمیشہ عزت اور آزادی کا پرچم بلند رکھا۔ نائیک سیف علی شہید اپنے باپ کی پہلی اولاد تھے۔ آپ کی ابتدائی دینی تعلیم خاندان کے رسم ورواج کے مطابق گھر میں ہی مکمل ہوئی جہاں آپ نے اپنے والد اور والدہ سے قرآن پاک پڑھا۔ آپ بچپن ہی سے دین کی طرف راغب تھے اور مسجد میں باجماعت پنجگانہ نماز ادا کرتے اور کوشش کرتے کہ سب سے پہلے مسجد میں پہنچ کر اذان دی جائے۔ معصوم خان کا یہ معصوم اور پیارا بیٹا سارے گاؤں کی آنکھ کا تارا تھا۔ سیف علی کی ذہانت سے گاؤں کا ہر فرد واقف تھا۔ آپ ہمیشہ دوسروں کی بات دھیان سے سنتے اور بہت کم گفتگو کرتے۔ آپ کوئی ایسی بات نہ کہتے جس سے دوسرے کی دل آزاری ہو۔ آپ انتہائی معاملہ فہم اور مستقل مزاج انسان

تھے۔

نائیک سیف علی جنجوعہ شہید نے ابتدائی تعلیم مقامی سکول سے حاصل کی اور پھر دیگر دینی کتب کا درس علاقہ کے علماء سے حاصل کیا۔ آپ اردو اور فارسی زبان کی کتب کا مطالعہ کرتے تھے جبکہ قرآن پاک کی کئی تفسیروں کا مطالعہ آپ کے علم کا باعث بنا۔ نائیک سیف علی شہید کی ابتدائی تعلیم و تربیت نے ان کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔ انہیں بچپن ہی سے احساس تھا کہ ان کی مادر دھرتی پر ڈوگروں کی غاصبانہ حکومت ہے جو کہ شخصی حکمرانی کے ظالمانہ ہتھکنڈوں سے عوام کے حقوق اور خاص کر مسلمان آبادی سے امتیازی سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ عوامی حقوق اور انسانی آزادی کی اس جنگ کا سلسلہ ایک عرصہ سے آپ کے آباو اجداد جاری رکھے ہوئے تھے۔ آپ کے دادا اور نانا نے علاقہ کے سرداروں کی مدد سے بار ہا حکمرانوں کو عوامی پریشانیوں سے واقفیت دلانے اور علاقہ کے عوام کو سہولیات بہم پہنچانے کا مطالبہ کیا جس کے صلے میں تنگ نظر حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بھی بنے۔

سیف علی شہید نے ان سیاسی اور سماجی حالات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جس کا ذکر وہ اپنی ابتدائی عمر میں ہی اپنے دوستوں سے کرتے اور ان پریشانیوں کے ازالے کی تدابیر سوچتے۔ اس دور میں آپ اپنی تعلیم و تربیت کے علاوہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ علاقہ کے سفر پر بھی نکلتے رہے۔ آپ کے بزرگ چونکہ ایک معتبر سماجی شخصیت تھے اس لئے آپ کا گھر اکثر عوامی مہمان خانہ بنا رہتا۔ تحصیل مینڈھر اور گردونواح کی معتبر شخصیات اکثر آپ کے نانا سے صلاح مشورے کے لئے آتیں تاکہ مسلم آبادی پر ڈوگرہ قوانین کی گرفت کم کرنے اور عوام پر حکومت کی جانب سے لاگو بے جا ٹیکس کم کروانے کے لئے عوامی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ آپ ایک طرف اپنے بزرگوں کی گفتگو اور مہمانوں کی رائے سے اپنے علم میں اضافہ کرتے اور دوسری جانب آپ کے دل میں ظلم و جبر کے خلاف نفرت کا لاوا پکنا شروع ہوا جس نے آگے

چل کر ظلم و جبر کے خلاف ایک اہم کارنامے کا روپ دھار لیا۔

سیف علی جنجوعہ کے والد کا گھرانہ ان کی تین چھوٹی بہنوں نور بیگم، شاہ بیگم، سید بیگم اور چھوٹے بھائی فقیر محمد پر مشتمل تھا جبکہ شاہ بیگم اور سید بیگم جڑواں بہنیں تھیں۔ سیف علی جنجوعہ اپنی تعلیم و تربیت جو کہ خالصتاً دینی اور روحانی تھی سے فارغ ہوئے تو کچھ عرصہ تک اپنے بزرگوں کی خدمت گزاری کے لئے ان کے کھیتوں پر کام کیا۔ آپ خوش الحان اور خوبصورت جوان تھے۔ ایک عرصہ تک موضع کھنڈ ہاڑ کی مسجد سے صبح سویرے اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے اور بعض اوقات امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ مردانہ خوبصورتی اور وجاہت کا یہ مجسمہ فطرت کے حسن کا بھی شیدائی تھا۔ گھبرو سیف علی کے دوستوں کا حلقہ با ادب اور کچھ کر گزرنے والے نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ سیف علی اکثر دوستوں کی محفل میں بیٹھتے اور حضرت میاں محمد بخشؒ عارف کھڑی کا کلام سیف الملوک بڑے شوق سے سنتے۔ گاؤں کے اردگرد اونچی چوٹیوں پر چڑھ کر وطن کی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے اور کائنات کی رعنائیوں کو دامن میں سمیٹے مستقبل کی راہوں کا تعین کرتے۔

عسکری زندگی کا آغاز

سیف علی جنجوعہ جب اٹھارہ برس کے ہوئے تو دوستوں کے مشورے سے فوج میں شامل ہوکر دیس دیس کی سیر اور مطالعہ کائنات کا فیصلہ کیا۔ آپ کے بعض دوستوں نے سٹیٹ آرمی میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا مگر اس طرح آپ کا سفر شوق صرف کشمیر تک ہی محدود ہوجاتا۔ آپ نے زمانہ طالب علمی کے دوران جموں اور سری نگر اپنے بزرگوں کے ہمراہ دیکھے ہوئے تھے اس لئے باقی دنیا دیکھنے کا واحد ذریعہ برطانوی ہند کی فوج میں شمولیت تھا۔ اس دور میں برطانوی فوج میں بھرتی ہونا آسان کام نہیں تھا۔ انگریز مارشل ریس کے عقیدے کا پابند تھا۔ اس کے علاوہ فوجی جوانوں کی برطانوی افواج میں شمولیت کے لئے لمبا سفر اختیار کرتے ہوئے میرٹھ، پونے اور جبل پور جانا ہوتا تھا اور پھر اگر کسی وجہ سے بھرتی نہ ہوتے تو واپسی کا مرحلہ اور بھی کٹھن اور دشوار ہوتا۔ سیف علی نے اس مہم کا پکا ارادہ کیا اور اپنے بزرگوں اور دوستوں کی اجازت سے ہندوستان کے سفر پر چل نکلے۔ سیف علی نے اٹھارہ مارچ 1941ء کو برطانوی ہند کی رائل انجینئرز میں شمولیت اختیار کی۔ ابتدائی تربیت کے بعد آپ اپنی یونٹ کے ہمراہ کچھ عرصہ بغداد اور مصر میں تعینات رہے اور بعد ازاں آپ کی یونٹ جالندھر اور لاہور کی چھاؤنیوں میں بھی مقیم رہی۔ آپ کی مختصر فوجی زندگی جو کہ چھ سال چار ماہ اور انتیس دن پر مشتمل ہے بھی مثالی تھی۔ آپ کی اس عسکری خدمت کے صلے میں حکومت برطانیہ نے آپ کو تمغہ دفاع اور تمغہ جنگ سے تو نوازا ہی تھا مگر جو کام آپ نے ایک عاشق رسول ﷺ کی حیثیت سے کیا اس کا صلہ رب العزت نے آپ کو شہادت کے عظیم رتبے اور آزاد حکومت کی جانب سے ہلال کشمیر جو کہ جنگ آزادی کا سب سے بڑا اعزاز ہے

بھی عطاء کیا۔آپ اپنی فوجی زندگی کے دوران بھی نماز کی پابندی کرتے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی دینی تربیت میں بھی کوئی کسر باقی نہ چھوڑتے۔فوج میں رہتے ہوئے آپ اپنے دوستوں کو نماز اور قرآن پاک پڑھنا سکھاتے اور فارغ وقت میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے۔چھٹی کے دوران آپ مختلف موضوعات پر کتابیں خرید کر لاتے اور علاقہ کے نوجوانوں میں تقسیم کرتے تاکہ انہیں دنیا کے بدلتے ہوئے حالات خاص کر ہندوستان اور کشمیر کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے آگاہی ہو۔آپ اکثر دوستوں سے کہتے کہ میں نے برطانوی فوج کی نوکری مطالعہ، سیر، سفر اور تربیت کے لئے کی ہے ورنہ رزق کی یہاں گاؤں میں کیا کمی تھی۔میرا مقصد شاید کچھ اور ہے اور جب میں مقصد کی طرف لوٹ کر آؤں تو تم سب میری مدد کرنا۔سیف علی کی چھٹیاں اکثر فلاحی اور علمی مباحثوں میں گزرتیں۔سیف علی کی بیوہ کے مطابق ان کا گھر بھی ایک مدرسہ تھا جو کہ زمانہ جنگ میں مجاہدین کی تربیت گاہ بن گیا۔

عاشق رسول ﷺ

داناؤں کا قول ہے کہ جو شخص جنگ کے روز میدان جنگ میں ڈٹ جاتا ہے وہ اپنے خون سے کھیلتا ہے اور جو بھاگ جاتا ہے وہ دوسروں کے خون سے کھیلتا ہے۔ اپنے خون سے کھیلنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں چونکہ جان سے قیمتی اور عزیز کوئی چیز نہیں ہوتی۔

جنگ، طوفان، قحط اور طغیانی میں لوگ اپنی قیمتی چیزیں، مال اسباب اور بچے سب کچھ چھوڑ کر صرف جان لے کر بھاگتے اور محفوظ جگہوں کی تلاش میں چل نکلتے ہیں مگر ان حالات میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی جانیں دوسروں کی حفاظت کیلئے وقف کر دیتے ہیں۔ انسان کے اندر یہ خوبی اور جوہر ایک ہی دن پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ خوبی اس کے خمیر میں ابتداء ہی سے موجود ہوتی ہے جسے عیاں کرنے اور جوہر دکھانے کا موقع ہر کسی کی تقدیر میں نہیں ہوتا۔

نائیک سیف علی جنجوعہ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو دوسروں کیلئے اپنا آج قربان کرتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی سب سے قیمتی چیز جان کسی بھی لمحے جان آفریں کے سپرد ہو سکتی ہے وہ میدان کارزار میں ڈٹے رہتے ہیں۔ سیف علی نے جس بہادری کا مظاہرہ پیر کلیوا کی پہاڑیوں پر کیا اس کا جوہر ان کی روح میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ سیف علی شہید ایک دیندار اور باوصف مجاہد تو تھے ہی مگر ان کی روح عشق رسول ﷺ سے بھی سرشار تھی۔ لاہور میں تعیناتی کے دوران سیف علی کسی کام کیلئے بازار گئے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک نوجوان ہندو بادہ خوار مستی کے عالم میں ایک چوک میں کھڑا شان رسول ﷺ میں گستاخی کا مرتکب ہو رہا تھا اور ایک ہجوم اس کے چاروں طرف کھڑا تھا۔ غازی علم

دین شہیدؒ کے شہر میں کئی مسلمان نوجوان بھی وہاں موجود تھے مگر کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ گستاخ رسول ﷺ کی زبان بند کرتا۔

سیف علی جنجوعہ جو اس وقت وردی میں ملبوس تھے نے ہجوم میں جا کر پوچھا کہ کوئی اس گستاخ کی زبان کیوں نہیں روکتا۔ ہندو نوجوانوں نے فوجی کی اس بات کا مذاق اڑایا اور مسلمانوں نے بیچارگی سے کہا کہ یہ ایک بڑے کانگریسی سیٹھ کا بیٹا ہے اور مقامی کالج کی یونین کا لیڈر ہے اسے کچھ کہنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ مسلمان نوجوانوں نے سیف علی کو وہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا چونکہ وہ وردی میں تھے اور ان کی طرف سے ہندو کو کچھ کہنا ان کے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔ مسلمانوں کی بے بسی دیکھ کر بھلا سیف علی جیسا شخص کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ سیف علی نے اپنا بیلٹ اتارا اور ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور ہندو بادہ خوار کی بیلٹ سے پٹائی شروع کردی۔ آپ کی جرأت اور بہادری دیکھ کر ہندو نوجوان وہاں سے کھسک گئے۔ آپ ایک ہاتھ سے ہندو پر اپنے بیلٹ برسا رہے تھے اور دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا ہندو نے اپنے منہ میں ڈالا ہوا تھا اور وہ اپنی جان چھڑانے کی خاطر آپ کا انگوٹھا چبا رہا تھا۔ سیف علی نے اپنے انگوٹھے کی پرواہ کئے بغیر ہندو کو اتنا مارا کہ اس کا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ مار کھا کر زمین پر گرا اور آپ کے قدموں کو چومنے لگا۔

سیف علی نے مغلوب ہندو کو کھڑا کیا اور حکم دیا کہ جس گندی زبان سے وہ شان رسول ﷺ میں گستاخی کر رہا تھا اسی سے ہجوم کے سامنے معافی مانگے ورنہ وہ جان سے جائے گا۔ ہندو نے ہاتھ جوڑ کر گستاخی کی معافی مانگی اور زخم خوردہ ہو کر چل دیا۔

اس واقعہ کی رپورٹ سیف علی کی یونٹ میں ہوئی تو یونٹ کے مسلمان افسروں نے سیف علی کے جذبات کا دفاع کرتے ہوئے آپ کو فوجی سزا سے بچالیا۔ ہندو بادہ خوار نے

مار کھاتے ہوئے آپ کا انگوٹھا اس قدر چبایا کہ ہڈی ریزہ ریزہ ہو کر ناکاہ ہو گئی فوج سے واپس آکر آپ اکثر دوستوں کو اپنا ہاتھ دکھاتے اور ہنس کر کہتے کہ فوج کی نوکری میں میرا ہاتھ خوش قسمت رہا کہ اس کا انگوٹھا راہ حق میں شہید ہو گیا اے کاش! میرے جسم کو بھی خدا قبول کرے اور شہادت کی لذت نصیب ہو۔

وطن واپسی اور حیدری فورس میں شمولیت

جنگ عظیم دوئم کے بعد برطانوی ہند کی افواج میں کمی کی گئی تو نائیک سیف علی بھی سولہ اگست 1947ء کو ریٹائر ہو کر واپس گاؤں آ گئے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت آپ کی عمر 25 سال تھی اور اس زمانہ میں تحریک آزادی کشمیر پورے زوروں پر تھی۔ آپ نے گاؤں واپس آ کر علاقہ کے سردار جناب فتح محمد خان کریلوی سے ملاقات کی اور ان کی دفاعی اور فلاحی کمیٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ سردار فتح محمد خان کریلوی نے مہاراجہ کشمیر کی نیت کو بھانپ لیا تھا چونکہ مہاراجہ کشمیر ایک طرف تو پاکستان کے ساتھ معاہدہ قائمہ پر دستخط کر کے پاکستانی قیادت کو دھوکہ دے رہا تھا تو دوسری جناب راشٹر یہ رائفل، سکھ اور گورکھا رجمنٹوں کے سینکڑوں جوانوں کو جدید اسلحہ سے لیس کر کے پونچھ، باغ، میر پور، گلگت اور سکردو بھجوا رہا تھا۔ ریاستی پولیس نے مسلمانوں کو ذاتی اسلحہ جمع کروانے کا حکم دیا جبکہ ضبط شدہ یہی اسلحہ مقامی ہندو آبادی میں تقسیم کر دیا۔ اسی دوران 29 اگست 1947ء کو دوتھان کے مقام پر مجاہدین نے جو صرف قوت ایمانی سے لیس تھے نے سٹیٹ آرمی کی کمپنی پر پہلا حملہ کر کے ڈوگروں سے جنگ کا آغاز کر دیا۔

دیگر علاقوں کی طرح مینڈھر کے علاقہ میں بھی سردار فتح محمد خان کریلوی نے سابق فوجیوں کی مدد سے دفاعی کمیٹی بنائی تا کہ مقامی آبادی کی عسکری تربیت کر کے علاقہ کے دفاع کا بندوبست کیا جائے۔ سیف علی جنجوعہ نے اس کمیٹی میں شامل ہو کر اپنے مقصد کی تکمیل کا آغاز نوجوانوں کی تربیت سے شروع کر دیا۔ سیف علی جنجوعہ دفاعی اور فلاحی کمیٹی کے سرگرم رکن تھے۔ اس دوران آپ کی ملاقاتیں علاقہ کی اہم شخصیات سے ہوئیں جنہوں نے

آپ کے مشوروں کو سراہا اور انہیں آئندہ کے لائحہ عمل میں شامل کیا۔

ابتدائی جدوجہد اور فوجی کاروائیاں خالصتاً مقامی نوعیت کی تھیں۔ برطانوی ہند کی فوج سے فارغ ہونے والے افسروں، عہدیداروں، سپاہیوں نے اس ابتدائی جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسرے علاقوں کی طرح مینڈھر، کھوئیرٹہ اور ملحقہ پنجن کے علاقوں میں دفاعی کمیٹیوں نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔ یہ علاقے جموں اور نوشہرہ کی چھاؤنیوں کے قریب اور میرپور کے اہم اور بڑے شہر کو ملانے والی سڑکوں پر واقع تھے۔ میرپور اور پونچھ کے شمال مغربی اور مغربی علاقوں سے پسپا ہونے والی ڈوگرہ افواج بھی انہیں راستوں سے جموں کی طرف بڑھ رہی تھیں جبکہ بعض محصور چوکیوں اور چھوٹی چھاؤنیوں کو ڈوگرہ کمک کا دباؤ بھی انہیں علاقوں پر تھا اس لئے اس علاقہ کا دفاع انتہائی ضروری تھا۔

علاقہ کی دفاعی اہمیت کا احساس اور مستقبل میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے والے نوجوانوں کے قائد سردار فتح محمد خان کریلوی اور ان کے رفقاء کار جن میں سیف علی بھی شامل تھے کو ابتداء ہی سے چار محاذوں پر لڑنا پڑا۔ اوّل پسپا ہونے والی ڈوگرہ افواج سے سول آبادی کو محفوظ رکھنا دوئم نوشہرہ، پونچھ اور راجوری کی طرف سے دشمن کی یلغار کو روکنا، سوئم اسلحہ و ایمونیشن کا حصول، چہارم اپنوں کی بے رُخی اور اندرونی سازشوں سے بچنا۔ گو کہ آزادی کی جنگ دیگر علاقوں میں بھی جاری تھی مگر یہ خصوصی حالت دیگر جگہوں میں کم ہی تھی۔ سردار فتح محمد خان کریلوی کو ان حالات میں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو فوجی حکمت عملی کے علاوہ دیگر امور کا بھی ماہر ہو۔ سردار فتح محمد خان کریلوی نے نکیال کے جنوب میں لڑنے والے لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان آف پنجن، کرنل راجہ محمود خان آف تھروچی اور پونچھ کو محاصرے میں لینے والے سرداروں اور دیگر علاقائی کمانڈروں سے رابطے کے لئے نوجوان سیف علی سمیت چند نوجوانوں کو منتخب کیا اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ ضلع پونچھ کی تحصیل مینڈھر نے ضلع پونچھ

میں ہونے والی ابتدائی کاروائیوں کے دوران ہی ایک نازک صورت اختیار کر لی تھی۔مگر اس جدوجہد کا سہرا اپنے سر باندھنے والوں نے جنگل میں آگ تو لگا دی مگر اس کا رخ متعین کرنے اور اپنا کھلیان بچانے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی۔سدھنوتی، باغ اور حویلی سے پسپا ہونے والی ڈوگرہ فوج، راشٹر یہ رائفل، سیوک سنگھی جھتے اور پولیس کا رخ شمال میں اوڑی اور جنوب مشرق میں مینڈھر کی طرف تھا۔اوڑی کی جانب باغ اور دھیر کوٹ کے مجاہدین نے مظفر آباد اور اوڑی کا راستہ غیر محفوظ بنا دیا تھا اس لئے پسپا ہونے والوں کے علاوہ نوشہرہ اور راجوری کی طرف سے ممکنہ کمک کا واحد راستہ مینڈھر ہی سے گزرتا تھا جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے بھارت نے ابتداء ہی سے بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔

ان حالات میں جب ہر طرف خوف و دہشت کا راج تھا۔حکومت کے خلاف لوگوں کو بغاوت اور مسلح جدوجہد کے لئے تیار کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔لہٰذا اس مشکل کام کے لئے سردار فتح محمد خان کو بااعتماد اور پر استقلال ساتھیوں کی ضرورت تھی جو نہ صرف منصوبہ کو صیغہ راز میں رکھیں بلکہ جرأت و ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوجوانوں کو تربیت دے کر جدوجہد کے لئے تیار کریں۔

سیف علی جنجوعہ نے سردار فتح محمد کریلوی کے دیگر بااعتماد ساتھیوں کی طرح اپنے قبیلے کے سرکردہ نوجوانوں سمیت جدوجہد آزادی میں شمولیت اختیار کی اور سردار فتح محمد خان کے مشن کی تکمیل کے لئے نوجوانوں کی تربیت اور تیاری کا کام شروع کر دیا۔

سیف علی جنجوعہ نے سردار فتح محمد خان کے منصوبے کے مطابق ابتدائی کاروائیوں میں بھرپور حصہ لیا اور بہت سے مقامات پر ڈوگرہ پولیس اور راشٹر یہ رائفل کے بھگوڑوں اور امدادی دستوں کو گھات لگا کر واصل جہنم کیا۔سردار فتح محمد خان کی یہ فوج جس کا نام حیدری فورس رکھا گیا اتنی مختصر تھی کہ صرف وادی سورن جو کہ ایک وسیع علاقہ ہے اور آج کل اس سیکٹر

میں ایک بھارتی بریگیڈ تعینات ہے کو فتح کرنے کیلیئے صرف چودہ نوجوان بھجوائے گئے۔ جبکہ مینڈھر پر صرف پندرہ بیس نوجوانوں کی مدد سے سردار فتح محمد خان نے خود قبضہ کیا اور راجوری کی جانب سے آنے والی ڈوگرہ کمک کے خاتمے اور بھمبر گلی کی حفاظت کے لئے سیف علی جنجوعہ کو روانہ کیا گیا جن کے ساتھ صرف چار مسلح جوان تھے۔

حیدری فورس

ضلع پونچھ کی تحصیل مینڈھر، پونچھ شہر سے جنوب مشرق کی جانب واقع خطہ کے اہم علاقوں پر مشتمل تھی۔ چونکہ ان حالات میں مینڈھر فوجی اور تدبیراتی لحاظ سے ایک حساس علاقہ بن گیا تھا جس کا تب کے جنگی ماہرین اور خودساختہ کمانڈروں نے ذرہ بھر احساس نہ کیا۔ مینڈھر کا علاقہ تحریک آزادی (48-1947ء) کے دوران ریڑھ کی ہڈی بن گیا اور اس نازک وقت میں سردار فتح محمد خان کریلوی مرحوم نے اس حساس خطہ پر صرف 25 مسلم جوانوں جن کے پاس چند دیسی ساخت کی بندوقیں اور تلواریں تھیں کی مدد سے کمال ہوشیاری اور جرأت مندی سے قبضہ کرلیا۔ پونچھ کو نوشہرہ اور سری نگر سے ملانے والی واحد سڑک براستہ کہوٹہ، علی آباد، درہ حاجی پیر سے گزرتی اوڑی بارہ مولا اور پھر سری نگر تک جاتی تھی۔ نوشہرہ سے ایک سڑک براستہ کھوئیرٹہ اور اسی طرح میرپور سے براستہ کھوئیرٹہ ایک کچی سڑک کوٹلی سے مینڈھر کو ملاتی تھی مگر محدود آمدورفت کی وجہ سے ان راستوں پر لوگ زیادہ تر پیدل یا پھر گھوڑوں اور خچروں پر ہی سفر کرتے تھے۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں سردار فتح محمد خان کریلوی نے اپنے پیغام رساں کوٹلی، پلندری، باغ، کھوئیرٹہ، پنجن اور پونچھ بھجوائے تاکہ دشمن کا مقابلہ ایک باقاعدہ تدبیر اور تنظیم سے کیا جائے مگر پونچھ کے لیڈروں نے سردمہری کا مظاہرہ کیا اور سردار فتح محمد خان کریلوی کی کوئی مدد نہ کی۔

سردار فتح محمد خان کریلوی موضع کریلہ سابقہ تحصیل مینڈھر ضلع پونچھ کے رہنے والے تھے۔ سردار صاحب کو خداوند کریم نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ سردار صاحب نے کچھ عرصہ محکمہ پولیس میں نوکری کی مگر حاکم طبیعت نے محکومی کو قبول نہ کیا اور آپ نے

نوکری کی ٹوپی اتار کر خدمت خلق کا چوغہ پہن لیا۔ سردار فتح محمد خان کے بعض قریبی لوگوں سے پتہ چلا کہ وہ کم تعلیم کے باوجود انگریزی، فارسی اور اردو ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور روحانیت سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سردار مرحوم نے شیکسپئر، دانتے، غنی کاشمیریؒ، قرۃ العین طاہرہ، شیلے، سن توژو اور چانکیہ کو تحقیق کی حد تک پڑھا تھا۔ راوی نے سردار فتح محمد خان کریلوی کی ذہنی استعداد اور وسعت قلبی کا ذکر کرتے ہوئے بتلایا کہ سردار مرحوم کا ایک بیٹا جو کہ محکمہ تعلیم میں ہیڈ ماسٹر تھا سے سردار صاحب کی سینکڑوں کتابیں مل سکتی ہیں۔ میرا راوی اتنا معتبر تھا کہ مجھے سردار فتح محمد خان کریلوی کی اولاد سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی چونکہ اس طرح کی ملاقاتیں سیاسی رنگ میں بدل جاتی ہیں۔ میری تحقیق کے ماخذ بھی عام، سچے اور کھرے لوگ ہیں اس لئے حکمران طبقے سے مل کر تحقیق نہ صرف ادھوری ہو جاتی ہے بلکہ خوشامد میں بدل جاتی ہے۔ میں نے جس درویش صفت محبّ وطن کشمیری مجاہد سے سردار فتح محمد خان کریلوی کے علمی اور ادبی ذوق کے متعلق سنا ان کی باتوں کی سچائی میرے لیے اطمینان بخش ہے۔

کرنل حق مرزا اور میجر محمد حسین وہ شخصیات ہیں جنہیں تحصیل مینڈھر کے علاقہ میں کشمیر لیبریشن فورس کے ہیڈ کوارٹر کی طرف سے بھجوایا گیا تا کہ وہ اس حساس خطہ کا دفاع کسی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے تحت کریں اور سردار فتح محمد خان کریلوی کو امداد فراہم کریں۔ سردار فتح محمد خان نے ابتداء ہی میں مینڈھر، سورن کوٹ، دھرم شالہ اور ملحقہ نکیال پر قبضہ کر لیا اور اپنا ہیڈ کوارٹر دھرم شالہ میں قائم کیا۔ دھرم شالہ تحصیل ہیڈ کوارٹر اور ڈوگرہ فوج کا مرکز تھا جہاں سے ایک راستہ بھمبر گلی اور تھانہ سے ہو کر راجوری کو ملاتا تھا جو کہ دشمن کے لئے ایک اہم شاہراہ اور سپلائی کا راستہ تھا۔ دھرم شالہ سے جنوب کی جانب پیر کلیوا اور پیر سید فاضل کی پہاڑیاں قدرتی حصار تھیں اور علاقہ کے سردار براہ راست سردار فتح محمد خان کریلوی سے

رابطہ کئے ہوئے تھے۔ مینڈھر نالہ اور دریائے سورن کا درمیانی علاقہ بھی قدرے محفوظ تھا چونکہ اس علاقہ میں تب تک برف نہیں پگھلی تھی اور مقامی آبادی پوری طرح دشمن سے نبٹنے کے لئے تیار تھی۔ پونچھ اور راجوری مجاہدین کے محاصرے میں تھے اور تب تک اوڑی پر بھی مجاہدین کا کنٹرول تھا۔ سردار فتح محمد خان کریلوی نے دیگر کمانڈروں کی طرح فتح کا جشن منانے کے بجائے علاقہ پر کنٹرول حاصل کیا اور مزید کاروائیاں جاری رکھنے کے لئے پونچھ کا محاصرہ کرنے والے سرداروں سے مدد کی اپیل کی۔

سردار فتح محمد خان کریلوی سول ایڈمنسٹریٹر مینڈھر ایک زیرک قائد اور دور اندیش سیاست دان تھے۔ سردار فتح محمد نے اندازہ کرلیا تھا کہ جب تک راجوری اور شوپیاں پر قبضہ نہیں ہوتا پونچھ، سورن کوٹ، مینڈھر اور نوشہرہ کا عارضی محاصرہ ایک بیکار مشق ثابت ہوگی۔ کرنل ایم اے حق مرزا کی اصل ڈائری میں بھی درج ہے کہ جب ہم نے (کرنل مرزا اور میجر محمد حسین) دھرم شالہ میں سردار فتح محمد خان سے ملاقات کی تو ہم اس شخص کے منصوبے اور مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں سن کر حیران ہوگئے۔ ہمیں یہاں آکر اندازہ ہوا کہ پونچھ کا محاصرہ کرنے والے کمانڈر عہدے بانٹنے میں لگے ہوئے ہیں اور جو امداد پاکستانی عوام اور حکومت سے مل رہی ہے اس کا بڑا حصہ راولپنڈی ہی میں فروخت ہو رہا ہے اور یہ لوگ اپنے اپنے حصے کی رقم بانٹ رہے ہیں۔

سردار فتح محمد خان نے جتنے پیغامبر ہجیرہ، کھوٹہ اور راولاکوٹ بھجوائے سب کے سب مایوس لوٹے۔ ان پیغامبروں میں ایک نام شہید کشمیر نائیک سیف علی جنجوعہ کا بھی ہے جو اپنے قائد کی بے چینی اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے دور دراز سفر کرتے اور لوگوں کو جہاد میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

ریڈرز ان کشمیر کے منصف جنرل محمد اکبر خان نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے

اور اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ابتدائی کاروائیوں کے بعد جہادی لیڈر عہدے اور رتبے بانٹنے میں لگ گئے۔ درجنوں کپتانوں، میجروں اور کرنیلوں کے علاوہ دو فیلڈ مارشل اور آدھا درجن جرنیل اور دو عدد کیپٹن جنرل بھی بن بیٹھے۔ اس کے علاوہ دو آزاد جنرل ہیڈ کوارٹر بھی قائم ہو گئے جو روزانہ راولپنڈی میں قائم تیسرے آزاد جنرل ہیڈ کوارٹر کو اپنی اپنی کامیابیوں کی رپورٹیں بھجواتے۔ جنرل صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سب جرنیل باہم بھی لڑنے لگے اور جو جس کے ہاتھ آتا وہ اس پر قبضہ کر لیتا اور دوسرے کی ناکامی اور دشمن کے ہاتھوں شکست و ذلت دیکھ کر خوش ہوتا۔ بہت سا امدادی سامان راولپنڈی کے بازاروں میں فروخت ہو جاتا اور مجاہدین کھلے آسمان کے نیچے شدید موسمی حالات اور پوری طرح مسلح دشمن کا مقابلہ کرتے۔
کرنل ایم اے حق مرزا کی ڈائری پر مبنی کتاب ودرنگ چنار کے صفحہ 37 پر لکھا ہے کہ اس بات پر توجہ دینا ضروری ہے کہ پونچھ کا محاصرہ کرنے والی مجاہد فورس شمالی علاقہ جات سے لے کر بھمبر تک نسبتاً بڑی فورس تھی جس کے پاس ہتھیاروں، گولہ بارود، خوراک اور دیگر اشیاء ضرورت کی بھی کوئی کمی نہیں تھی تو پھر یہ فورس پونچھ پر قبضہ کرنے میں کیوں ناکام رہی؟ اس کے برعکس گلگت، سکردو، مظفر آباد، کوٹلی، میر پور اور بھمبر کو محاصرے میں لینے والے مقامی مجاہدین کو نہ تو پاکستان سے کوئی امداد میسر تھی اور نہ ہی ان کے پاس اپنے وسائل تھے مگر چند روز میں ان مقامی مجاہد کمانڈروں نے جو کہ سابقہ فوجی تھے نے نہ صرف یہ محصور شہر فتح کر لیے بلکہ دشمن کو للکارتے ہوئے جموں نوشہرہ روڈ تک پہنچ گئے۔ دوسری جانب وسائل سے مالا مال پونچھ کا محاصرہ کرنے والوں نے اسے ذریعہ معاش بنا لیا اور دشمن کو ستانے اور محاصرہ توڑنے کا موقع جان بوجھ کر فراہم کیا۔
سردار فتح محمد خان کریلوی کی محدود فورس جس کا نام حیدری فورس تھا کے حصے کی کمک بھی پونچھ جاتی تھی چونکہ ان کا علاقہ یعنی تحصیل مینڈھر پونچھ ضلع کی تحصیل تھی۔ پونچھ

کے فتح کئے ہوئے علاقوں میں سدھنوں، سیدوں، ڈھونڈوں اور عباسیوں کے باہمی اختلافات کا خاطر خواہ اثر مینڈھر پر بھی پڑا اور سردار فتح محمد خان کو پونچھ کے فیلڈ مارشلوں نے کسی قسم کی امداد دینے سے انکار کر دیا۔

ابتداء میں حیدری فورس کی تعداد 25 افراد پر مشتمل تھی جسے دو حصوں میں تقسیم کر کے دھرم شالہ تحصیل ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کیا گیا اور وہاں موجود ڈوگرہ پولیس اور دیگر ہندوؤں سے کچھ اسلحہ وایمونیشن لے کر اس فورس کی تعداد بڑھا کر چھتر کر دی گئی۔ دھرم شالہ پر قبضے کے فوراً بعد سردار صاحب نے گلہڈ پر بھی قبضہ کیا اور دس مجاہدوں پر مشتمل ایک دستہ سیف علی جنجوعہ کی قیادت میں دے کر راجوری کی جانب سے آنے والی ڈوگرہ کمک کا راستہ روک دیا۔ کوٹلی پر راجہ سخی دلیر خان اور نوشہرہ سراہ روڈ پر لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان شہید ستارہ جرأت (دوبار) کے کنٹرول کے بعد اس جانب سے پونچھ پہلے ہی محفوظ ہو گیا تھا۔ دھرم شالہ اور اردگرد کے علاقوں کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد سردار فتح محمد خان نے مجاہدین کا ایک دستہ وادی سورن میں روانہ کیا اور تھانہ سورن کوٹ پر قبضہ کر کے ڈوگرہ پولیس اور راشٹر یہ رائفل کی پلاٹون پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

سردار فتح محمد خان کی اس کاروائی کے بعد پونچھ کا دفاعی حصار اور مضبوط ہو گیا اور پونچھ شہر کا محاصرہ کرنے والی فوج کے کمانڈروں کا خیال تھا کہ جب جی چاہے گا پونچھ پر حملہ کر کے ڈوگرہ پولیس اور محصور فوج کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر نیت کے فتور، تکبر اور ہوس نے یوں اثر دکھایا کہ شہیدوں کے لہو کا صلہ جو صوابدیدی اختیار قدرت نے پونچھ شہر کا محاصرہ کرنے والوں کو عنایت کیا اس کا استعمال محصور فوج نے کیا اور مال واسباب بانٹنے والے جہادیوں کا محاصرہ توڑ کر ڈوگرہ فوج نے پونچھ کے ائر فیلڈ پر قبضہ کر لیا۔ کئی گھنٹوں کی تاخیر کے بعد جب مجاہدین نے ایئر فیلڈ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی تو بھارتی فوج نے

پیراشوٹ کے ذریعے ہتھیار، ایمونیشن اور راشن گرایا اور بعد میں فوج بھی اتار دی۔

حیدری فورس کی مشکلات

حیدری فورس نے قلیل افرادی قوت اور محدود مالی وسائل کے باوجود نائیک سیف علی جنجوعہ جیسے مردان حق اور سردار فتح محمد خان کریلوی جیسے زیرک اور مستقل مزاج قائد کی مدبرانہ قیادت میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے انہیں کسی افسانوی قصے یا من گھڑت پراپیگنڈے کی ضرورت نہیں۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد سردار مرحوم نے کوشش کی کہ کسی طرح ان کا رابطہ پونچھ فورس کے کمانڈروں سے ہوجائے اور فتح کئے ہوئے علاقوں پر کسی متحدہ فورس کا کنٹرول ہوتا کہ دشمن موسمی حالات کا فائدہ اٹھا کر مفتوحہ علاقوں پر پھر سے قابض نہ ہوجائے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ مینڈھر ضلع پونچھ کی تحصیل تھی اور حکومت پاکستان کی جانب سے جو امداد ملتی تھی وہ پہلے ضلعی کمانڈر کو ملتی اور ضلعی کمانڈر جہاں ضرورت محسوس کرتا یہ مدد فراہم کرتا۔ بدقسمتی سے پونچھ ضلع کو اس امداد کا جو سارے موجودہ آزاد کشمیر کو ملنے والی امداد کا بڑا حصہ تھا مقامی کمانڈر اپنے پاس رکھ لیتے اور جہاں اس کی ضرورت ہوتی وہاں پہنچانے سے گریز کرتے۔ سردار فتح محمد خان کریلوی دریائے سورن سے لے کر کھوئیرٹہ تک کے علاقہ پر کنٹرول حاصل کئے ہوئے تھے جو کہ تدبیراتی لحاظ سے نہایت ہی حساس خطہ تھا۔

سردار مرحوم کو اس بات کا ادراک تھا کہ پہاڑوں پر برف پگھلتے ہی بھارتی فوج نوشہرہ پونچھ روڈ اور درہ پیر پنجال پر قبضہ کر کے سارا کھیل بھگاڑ دے گی۔ سردار فتح محمد خان کریلوی نے بار بار پونچھ کا محاصرہ کرنے والوں کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا مگر کسی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر کار ہر طرف سے مایوس ہو کر سردار فتح محمد خان کریلوی نے جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی

سے رابطہ کیا اور جنرل ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے صاحبان کو احساس دلایا کہ اگر مینڈھر کا علاقہ دوبارہ دشمن کے ہاتھ لگ گیا تو نہ صرف محصور شہر پونچھ بلکہ کوٹلی اور کھوئیرٹہ کے علاقوں سمیت دریا پار کا سارا علاقہ بھارتی دسترس میں آجائے گا اور عین ممکن ہے کہ دشمن اپنی بھرپور قوت کا استعمال کرتے ہوئے آزاد پتن تک پہنچ جائے۔

سردار فتح محمد خان کریلوی نے اپنی مشکلات پونچھ کے کمانڈروں کی طرف سے بے اعتنائی، آزاد حکومت کی سست روی اور علاقہ کی حساسیت اور اہمیت سے جنرل ہیڈ کوارٹر کو مطلع کیا تو جنرل ہیڈ کوارٹر کی اجازت سے کرنل ایم اے حق مرزا جو تب کیپٹن تھے اور میجر محمد حسین کو آزاد کشمیر جنرل ہیڈ کوارٹر نے سردار فتح محمد خان کریلوی کی مدد کے لئے دھرم شالہ روانہ کیا اور ہدایت دی کہ سردار فتح محمد خان کریلوی کی تکالیف کا جائزہ لے کر ان کی مدد کی جائے۔

کرنل ایم اے حق مرزا کی ڈائری پر مبنی کتاب (وورنگ چنار) کے صفحہ 39 پر درج ہے کہ سردار فتح محمد خان کریلوی سابقہ ایم ایل اے وسول ایڈمنسٹریٹر تحصیل مینڈھر نے نامساعد حالات اور محدود وسائل کے باوجود جس طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے علاقہ کے نوجوانوں میں جذبہ جہاد بیدار کیا اور جس جرأت واستقلال سے ایک دشوار گزار اور دفاعی لحاظ سے انتہائی حساس علاقہ کو دشمن سے آزاد کروا کر عرصہ تک بغیر کسی کمک کے قبضے میں رکھا، ایک قابل تعریف اور قابل تحسین واقع ہے۔ کرنل مرزا اپنی اصل ڈائری میں لکھتے ہیں کہ دھرم شالہ پہنچے تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مینڈھر، نکیال، سورن کوٹ اور دیگر نواحی علاقوں کے لوگ سردار فتح محمد خان کریلوی کی قائدانہ صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہیں اور اپنا سب کچھ سردار کی آواز پر قربان کرنے کو تیار ہیں۔ اس علاقہ میں گوجروں اور ٹھکیالوں میں عرصہ سے شکر رنجی چلی آرہی تھی مگر حیرت کی بات کہ جب ڈوگرہ راج کے ظلم وجبر کے خلاف سردار فتح محمد خان

کریلوی نے آواز بلند کی تو گوجر قبیلے کے سردار چوہدری غلام حسین لاثانوی نے سارے اختلافات بھلا کر سردار فتح محمد خان کریلوی کو گلے لگالیا اوران کی قیادت میں اپنے قبیلے کے جوانوں کو لڑنے کا حکم دیا۔ چوہدری غلام حسین نے اپنے قبیلے کے مال مویشی، غلہ اور دیگر اشیاءضرورت بھی سردار فتح محمد خان کریلوی کی حیدری فورس کے لئے وقف کر دیں جو کہ قومی یکجہتی اور ملی غیرت کا ایک بے مثال واقع ہے۔

کیپٹن ایم اے حق مرزا اور میجر محمد حسین کی آمد پر سردار فتح محمد خان کریلوی نے حیدری فورس جس کی تعداد 313 تھی کی کمان ان فوجی افسروں کے حوالے کر دی اور خود کو ان کی معاونت کے لئے وقف کر دیا۔

ابتداء میں میجر محمد حسین اور کیپٹن ایم اے حق مرزا نے حیدری فورس کا رخ پیر پنجال کی جانب رکھا تا کہ سورن وادی اور درہ پیر پنجال پر ہر حال میں قابض رہا جائے اور پونچھ کی محصور فوج پر باغ بریگیڈ غالب آسکے۔ جنوب میں دشمن کا زمینی رابطہ بحال نہیں ہوا تھا اور نوشہرہ پر لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان کا دباؤ برابر جاری تھا جس کی وجہ سے دشمن کے لئے نوشہرہ مینڈھر اور پونچھ روڈ کا استعمال مشکل تھا۔ دشمن کا رخ ابھی سرینگر کی طرف تھا جہاں ہوائی جہازوں کے ذریعے لگاتار کمک بھجوائی جارہی تھی اور دشمن آئندہ چند ہفتوں میں درہ پیر پنجال کی جانب سے کسی بھی لمحے پونچھ پر یلغار کرسکتا تھا۔ میجر محمد حسین، کیپٹن مرزا اور سردار فتح محمد خان کریلوی نے اس دوران آزاد جی ایچ کیو راولپنڈی کو پیغام بھجوایا کہ اگر مجاہدین کے باہمی نفاق کو دور نہ کیا گیا اور انہیں کسی ایک مشترکہ کمانڈر کے ماتحت نہ لڑایا گیا اور پاکستانی فوج کی طرف سے کمک نہ بھجوائی گئی تو موسم کھلتے ہی دشمن پیر پنجال اور راجوری فرنٹ کھول دے گا اور ہر حال میں مجاہدین کے فتح کئے ہوئے علاقوں پر قابض ہو جائے گا۔ جی ایچ کیو (آزاد) اور جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی پر واضح کر دیا گیا کہ پونچھ کی تحصیل باغ، سدھنوتی اور

حویلی کے علاقوں پر قابض پونچھ بریگیڈ کے عہدے داروں کی اس سے آگے بڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں چونکہ ان کا دھیان آزاد حکومت کی تشکیل اور عہدوں کی تقسیم پر مرکوز ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان آرمی مداخلت کرے اور مجاہدین کے فتح کئے ہوئے علاقوں خاص کر، مینڈھر، راجوری، دھرم شالہ، وادی سورن کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے کر مجاہدین کو آگے بڑھنے اور دشمن پر گوریلہ کاروائیاں کرنے کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے آزاد کردے۔موسمی حالات، مجاہدین کی بے سروسامانی اور باقاعدہ فوجی قیادت کی عدم دستیابی کی طرف بار بار توجہ دلانے کے باوجود جی ایچ کیو آزاد اور حکومت پاکستان کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور مجاہدین بے ترتیبی اور بے سروسامانی کی حالت میں لڑتے رہے۔

مئی 1948ء میں پاک فوج کی جانب سے میجر انور کمال کو مینڈھر سیکٹر بھجوایا گیا جنہوں نے سردار فتح محمد خان کریلوی کی مدد سے مینڈھر بریگیڈ جس کا نام حیدری بریگیڈ رکھا گیا، تشکیل دیا۔

یہ بریگیڈ تین بٹالین پر مشتمل تھا جن کے نام بالترتیب پہلی، دوسری اور تیسری حیدری بٹالین تھے۔دوسری حیدری بٹالین درحقیقت میجر محمد شیر خان آف نوشیروان کی ریاسی بٹالین تھی جس کے مسلم صیغے 1947ء کی ابتدائی لڑائی کے بعد مینڈھر آ کر سردار فتح محمد خان کریلوی کی فورس میں شامل ہوئے۔دوسری حیدری بٹالین کی ابتدائی کمان کیپٹن ممتاز خان کے سپرد کی گئی جس کی شروع میں تعداد تقریباً ڈیڑھ سو نیم مسلح افراد پر مشتمل تھی۔اس فورس کی روح اور تربیت یافتہ دستہ جس نے ابتداء میں اس علاقہ میں اہم کارنامے سرانجام دیئے وہ مایہ ناز پلاٹون تھی جس کے کمانڈر نائیک سیف علی جنجوعہ تھے جنہیں خاص طور پر سردار فتح محمد خان کریلوی کی درخواست پر اس بٹالین میں شامل کیا گیا۔یوں تو اس فورس کا نام دوسری حیدری بٹالین تھا مگر حقیقت میں یہ ڈیڑھ کمپنی کے قریب نفری تھی۔اگر ہم اس ڈیڑھ کمپنی کا

مزید تجزیہ کریں تو یہ نفری اس سے بھی کم تھی۔ ریاسی سے پسپا ہو کر آنے والی ریاستی فوج سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں نے کئی معاملات میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا چونکہ میجر شیر محمد کی پالیسیوں سے علاقہ کے سول ایڈمنسٹریٹر سردار فتح محمد خان کریلوی اور دیگر کمانڈروں کو اتفاق نہیں تھا۔ بہت سی دیگر باتوں کے علاوہ میجر شیر محمد ریاسی سے مہاراجہ کے ذاتی فارم سے ہزاروں کی تعداد میں آسٹریلوی بھیڑیں، گھوڑے اور گائیں لیکر آئے تھے جنہیں وہ مال غنیمت سمجھ کر اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے مگر میجر محمد حسین، کرنل حق مرزا اور سردار فتح محمد خان کریلوی نے ان سے یہ مال غنیمت لیکر مجاہدین کے لئے وقف کر دیا۔ میجر صاحب اور ان کے کچھ ساتھی اس بات پر ناراض ہو کر جہلم چلے گئے۔

کرنل ایم اے حق مرزا کی ڈائری کے مطابق میجر شیر محمد جنگ آزادی کے دوران غائب رہے اور کسی بھی محاذ پر ان کی موجودگی کا سراغ نہ ملا۔ بعد میں وہ بلوچ رجمنٹ میں چلے گئے جہاں انہیں ستارہ جرأت دیا گیا اور وہ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

کشمیر کے وارث

کشمیر اور روحانیت کا رشتہ ایسے ہی ہے جیسے جسم کا روح سے۔ کشمیر کی تاریخ کا کوئی باب ایسا نہیں جس کی ابتداء واختتام اولیاء کرام کے ذکر سے نہ ہو۔ یہاں کے پہاڑ، مساجد، قلعے، دریا غرضیکہ قدرت کا کوئی عطیہ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی عاشق رسول ﷺ سے منسوب نہ ہو۔

کشمیر کی مٹی میں روحانیت کی خوشبو ہے اور جو کوئی اس مٹی پر قدم رکھتا ہے وہ اس کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی پر اس کا اثر نہ ہو اور اس کے دل میں عشق حقیقی کا شعلہ نہ بھڑکے تو اسے چاہئے کہ وہ اس مٹی سے اپنے قدم ہٹا لے اور اپنا تجزیہ کرے۔ کشمیر میں جو پہلی اسلامی حکومت قائم ہوئی اس کا سبب بھی ایک درویش تھا اور جب آزادی کا سورج غروب ہوا اور غلامی کی ابتداء ہوئی تو اس کا سبب بھی درویش ہی بنا۔ پہلے مسلمان بادشاہ نے ایک صوفی کی کرامات سے متاثرہ ہو کر دین اسلام قبول کیا اور اپنے کردار و عمل کی روشنی سے سارے کشمیر کو منور کر دیا۔ پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ بادشاہ نے تزکیہ نفس اور مجاہدہ چھوڑ کر عیش وعشرت کی زندگی اپنالی۔ بزرگان دین اور علماء حق کی تذلیل کی۔ انہیں سزائیں دیں اور فرقہ واریت اور اقرباء پروری کو فروغ دیا اور آخر کار وہ انہیں خرافات کی بھینٹ چڑھ گیا اور جاتے جاتے کشمیر کی صدیوں پرانی تاریخی عظمت پر قدغن لگا کر ایک غیور اور پرعزم قوم کو غلامی کی زنجیر پہنا گیا۔

1947-1948ء کی تحریک کی ابتداء بھی روحانی تھی مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے مادیت کا چوغہ پہن لیا اور فتح کا منظر شکست کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ معجزاتی اور

کراماتی واقعات کا سلسلہ بند ہو گیا تو دھند اور بادلوں نے مجاہدین کو اپنی لپیٹ میں لیکر دشمن کے مورچوں اور ہوائی جہازوں کے بموں سے محفوظ کرنا بھی چھوڑ دیا۔

بہت سے عینی شاہدوں نے بتایا کہ لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان شہید نے جب نوشہرہ پر حملہ کیا تو کچھ ایسے مجاہدین بھی ان سے آن ملے جن کا بعد میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کدھر گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ نوشہرہ چھاؤنی پر مکمل قبضہ اور کنٹرول حاصل کرتے کچھ فوجی افسروں اور قبائلی لشکریوں نے لیفٹیننٹ مظفر خان سے کمان لے لی اور انہیں واپس کیری اور سراہ کی طرف بھجوا دیا۔ لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان شہید ستارہ جرأت (دوبار) سے نوشہرہ کا کنٹرول چھیننے والوں کا حشر بھی دردناک ہوا اور کچھ ہی دنوں میں فوجی افسر اپنے قبائلی دوستوں کے ہمراہ براستہ ہری پور دیوتا گولہ پہنچے اور نوشہرہ بھارتیوں کے حوالے کر دیا۔ قرآن کریم میں واضح الفاظ میں خدا نے وعدہ کیا ہے کہ جب تم کفر کے خلاف نبرد آزما ہو گئے تو مقدس روحیں اور فرشتے تمہاری مدد کو آئیں گے مگر افسوس کہ کفر سے نبرد آزما ہونے والے جب روحانیت اور فرشتوں کی شمولیت کو مانتے ہی نہ ہوں تو ایسے خشک جہاد میں کامیابی کہاں سے آئے۔

میری تحریر کے ہیرو نائیک سیف علی جنجوعہ شہید اولیاء کرام کے قدردان اور دین اسلام سے گہرا لگاؤ رکھنے والی شخصیت تھے۔ شہادت سے قبل بہت سے معرکوں میں قدرت کی طرف سے انہیں رہنمائی ملتی رہی اور بے شمار ایسے واقعات رونما ہوئے جب کسی روحانی شخصیت نے انہیں دشمن کے نرغے سے بچ نکلنے کا قبل از وقت اشارہ دے دیا۔

اس سلسلہ کے دو واقعات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں جس سے اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ خطہ کشمیر کے اصل وارث خدا کے وہ بندے ہیں جن کی وساطت سے یہاں دین اسلام کی روشنی پھیلی اور جب تک ان بزرگان دین کی منشاء و مرضی کے مطابق تحریک آزادی کا مزاج نہیں ہو گا آزادی کی منزل نصیب نہیں ہو گی۔

یوں تو مجھے بے شمار ایسے واقعات سننے کو ملے کہ کس طرح مجاہدین کی مدد کے لئے غیبی قوتیں کارفرما رہیں اور بہت سی ناممکنات کو قدرت نے ممکن بنا دیا مگر جن واقعات کا میں ذکر کر رہا ہوں ان کا تعلق کرنل ایم اے حق مرزا کی ڈائیری سے ہے۔ایک واقعہ اس ڈائیری سے منسوب کتاب (ودرنگ چنار) کے صفحہ 101 پر بھی بیان کیا گیا ہے جس میں پیر پنجال صاحب سے کرنل صاحب کے شکوہ اور ناراضگی کا ذکر ہے۔جب کرنل ایم اے حق مرزا نے پیر پنجال صاحب سے ناراضگی کا اظہار کیا کہ آپ اللہ کے ولی ہو کر دشمن کے ساتھ رہتے ہو۔ درہ پیر پنجال جہاں وہ حملہ کرنا چاہتے تھے تب بھارتی فوج کی ایک کمپنی کے قبضہ میں تھا جبکہ مجاہدین بے ہتھیار اور تعداد میں بھی کم تھے۔اسی درہ میں پیر پنجال صاحب کا مزار بھی ہے اس لئے کرنل صاحب نے شکوہ کیا کہ ہم بے سروسامانی کی حالت میں موسم کی شدت اور دشمن کی توپوں کے گولوں کو برداشت کر رہے ہیں اور آپ اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہو کر یہ تماشہ دیکھ رہے ہو۔

کرنل صاحب لکھتے ہیں کہ میری ناراضگی اور شکوے کا جواب اسی رات مل گیا۔ پھر کیا تھا! اللہ نے سبب پیدا کیئے۔کرنل کمال پونچھ کا محاصرہ کر کے بیٹھے ہوئے جرنیلوں سے ایک ہلکی ماٹر اور مشین گن ادھار مانگ کر لائے تو دریائے پونچھ نے بھی مدد کی اور جیپ بمع کرنل کمال، مارٹر، مشین گن اور ایمونیشن کے دریا عبور کر گئی۔نفری کی کمی بھی خدا نے پوری کر دی اور بھولے بسرے مجاہدوں کا ایک گروپ خود ہی ہم سے آن ملا۔مارٹر بغیر سائیٹ کے ہدف پر گولے گرانے لگی، مشین گن نے بھی خوب کام کیا اور دشمن نے کسی حرکت کا جواب ہی نہ دیا۔جب زمینی حملہ شروع ہوا تو مجاہدین کی حرکت بادلوں نے خفیہ رکھی اور درہ پیر پنجال پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔

یہ تو تھے پیر پنجال صاحب۔اب کرنل حق مرزا کے بیان کردہ بہت سے واقعات

میں سے ایک دوسرا واقعہ یوں ہے کہ جب کرنل صاحب 1965ء کی جنگ کے دوران گوریلا مشن پر کشمیر گئے تو سرحد عبور کرنے سے پہلے مظفر آباد کے علاقہ دواریاں شریف میں اللہ کے ایک ایسے ہی نیک بندے سے ملاقات ہوئی۔ کرنل صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم حافظ صاحب کے گھر پہنچے تو وہ پہلے سے ہمارے منتظر تھے۔ ہم نے گزارش کی کہ کشمیر کی آزادی اور ہمارے مشن کی کامیابی کے لئے دعا کریں۔ حافظ صاحب نے فرمایا میں اس سلسلہ میں بہت کوشش کر چکا ہوں مگر باطنی امور میں فی الحال کشمیر کی آزادی ممکن نہیں۔ میں تھک گیا ہوں کیا کروں میری کوئی نہیں سنتا۔ چونکہ سلطان العارفین کا حکم نہیں کہ کشمیر تم لوگوں کے حوالے کیا جائے۔ ہاں! تم جس مشن پر جا رہے ہو خدا تمہیں کامیابی دے گا۔

کرنل صاحب لکھتے ہیں کہ ہم جس مشن پر گئے تھے اس میں کامیاب ہوئے اور بغیر نقصان کے واپس بھی آ گئے۔ واپسی پر حافظ صاحب کے آستانہ پر حاضری کے لئے پہنچے تو پتہ چلا کہ جس روز ہم نے سرحد عبور کی تھی حافظ صاحب نے چپ اختیار کر لی اور کسی سے ملنا جلنا اور کھانا پینا بھی بند کر دیا تھا۔ وہ دن رات عبادت کرتے رہے حتیٰ کہ انہیں بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ جب ہم ان سے ملے تو بڑی مشکل سے انہوں نے بات کی اور پانی پیا۔ حافظ صاحب سے مل کر ہم مظفر آباد پہنچے تو دوسرے دن اخبار میں پڑھا کہ حافظ صاحب (دواریاں شریف) اس دنیا سے کوچ فرما گئے ہیں۔ کرنل مرزا لکھتے ہیں کہ جب ہم دشمن سے نبرد آزما تھے اور زمینی مشکلات برداشت کر رہے تھے تو اللہ کا یہ نیک بندہ تزکیہ نفس اور مجاہدہ کی کیفیت میں تھا۔ اللہ نے اپنے نیک بندے کی فریاد سن لی اور ہمیں کامیابی دی مگر ان کا کمزور جسم تزکیہ برداشت نہ کر سکا اور روح خالق حقیقی سے جا ملی۔

حالیہ تحریک کے سلسلہ میں کچھ لوگ تربیت کے لئے ایک جماعت کے ساتھ گئے ہوئے تھے واپسی پر ان میں سے کچھ قبلہ نورالدین اویسی کشمیریؒ (مرحوم) جو اس وقت موضع

کسگمہ ضلع میر پور میں اپنے ایک مرید کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے سے ملنے آئے۔ قبلہ محمد نورالدین صاحبؒ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ وہ اپنے گھروں کولوٹ جائیں، رزق حلال کمائیں اور اپنی اولاد کی تربیت کریں۔ یہ لوگ حیران تھے کہ قبلہ نے ان کی تحریک آزادی میں شمولیت پر خوشی کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ بہرحال جو حالات اور واقعات سامنے ہیں اور جس طرح موجودہ تحریک سوٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر ٹکڑا اپنی قیمت پر اتحاد میں شامل ہے اور کسی بھی لمحے حریت کانفرنس چھوڑنے کیلئے پر تول رہا ہے۔ پھر آزاد کشمیر میں حکومتی کھیل اور اس کھیل کے مہروں کی شاہانہ زندگیاں اور عیش وعشرت کی نت نئی کہانیاں شائد کشمیر کے وارثوں کو پسند نہیں اور نہ ہی اس تحریک کو سلطان العارفینؒ کی حمایت حاصل ہے۔ روحانیت کے طالب علموں کا خیال ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے دورہ بھارت میں ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں شیخ الہند نے اپنے آستانے پر حاضری کا موقع نہیں دیا۔ میں نے دریافت کیا کہ ان مزاروں پر سارا دن چرسی، بھنگی فاحشہ عورتیں، جیب کترے اور قسم قسم کے لٹیرے پھرتے ہیں اور دربار کے احاطہ میں برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں تو تمہارے شیخ الہند انہیں زندہ درگور کیوں نہیں کرتے۔ طالب علموں کے لیڈر نے کہا کہ یہ شیخ کی مرضی۔ مکہ سے آنے والے حاجی بھی تو ہیں۔ دوسرا بولا یہ ربّ کی مرضی ہے۔ ابوجہل اور ابولہب بھی تو وہیں رہتے تھے۔ تیسرا بولا جس کی جتنی سلطنت ہے وہ اپنا حکم چلاتا ہے۔ اس کی مرضی جسے پسند کرے یا ناپسند۔ چوتھا خاموش بیٹھا تھا کہنے لگا آزاد کشمیر اسمبلی میں مشائخ اور علماء کرام بھی تو موجود ہیں۔ ولی کامل نبی ﷺ کے باطنی امور کا وارث ہوتا ہے اگر یہ لوگ واقعی مشائخ یعنی ولی کامل ہیں تو ان ہی سے پوچھ لو کہ سلطان العارفین کیوں نہیں مانتے۔ مجاہد اوّل سردار محمد عبدالقیوم خان خود بھی فقر وولائت کے دعویدار ہیں جب کہ پیر عتیق الرحمان بھی اسمبلی کی نشست پر عرصہ سے قابض ہیں۔ پہلا پھر بولا:- مسئلہ کشمیر ایک روحانی مسئلہ ہے بلیک لیبل

والے اسے حل نہیں کر سکتے۔منافقین کا درجہ کفار سے بدتر ہے۔مسئلہ کشمیر یو این او میں نہیں بلکہ اصل وارثین کی پنچائیت میں لے جاؤ تو حل ہو جائے گا۔اس سے پہلے کہ دوسرا پھر بول اٹھتا میں نے اجازت چاہی اور محفل سے اٹھ آیا۔اے کاش! کوئی اصل وارثوں سے بھی رابطہ کرے۔

درویشوں کے دسترخوان سے اٹھا تو من کی دنیا میں ڈوب گیا۔میرے من کی دنیا اندھیروں کی نہیں بلکہ اجالوں کی ترجمان ہے اس میں نور کی کئی ندیاں رواں ہیں جن کا منبع سلطان العارفین کے وطن میں ہی ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں مولانا محمد امین اویسی کشمیریؒ نے سلطان العارفین کے پیغام کو ایک نئے انداز سے مخلوق خدا تک پہنچایا۔اس پیغام کو عالمگیریت بخشنے کے لئے ایک پیامبر محمد نورالدین اویسی امینی کشمیریؒ نے اپنی ساری زندگی تزکیہ ومجاہدہ میں گزاردی اور مادی الائیشوں کو قریب نہ آنے دیا۔

میں سوچ کی وادیوں میں گھوم رہا تھا کہ سلطان العارفین کے پیامبر نے آواز دی۔ یہ آواز میری جانی پہچانی تھی! ہاں یہ وہی آواز تھی جسے میں کئی سالوں تک ظاہری دنیا میں بھی سنتا رہا مگر اب یہ عالم باطن میں منتقل ہوگئی ہے۔یہ آواز اس شہید کی ہے جس نے اپنا نوجوان خون دیکر کشمیر کی وراثت میں اپنا نام لکھوایا اور سلطان العارفین کی سلطنت میں اپنا مقام بنالیا۔

وہ بولا جاؤ اب سیف علی شہید کی باری ہے تم نے اپنا وعدہ پورا کیا اب سیف علی شہید کا پیغام اہل وطن تک پہنچادو۔ یہ پیغام مٹی کے وارثوں کا ہے۔یہ مٹی شہداء کے خون اور اولیاء کرام کے سجدوں سے عبارت ہے اسے ناپاک لوگوں کا مسکن نہیں بنایا جاسکتا۔اس کی وراثت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو ورنہ یونہی غلامی کی زنجیر پہنے رہو گے۔اپنا تجزیہ کرو اور دیکھو کیا تم واقعی اولیاء کرام اور شہداء کی سرزمین کی وراثت کے قابل ہو؟

نہیں تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو کشمیر کی وراثت کا حقدار ہو۔ یہاں ہر شخص اور عہدہ بکاؤ ہے۔ یہاں چپڑاسی، کلرک، کلکٹر اور جج بکتا ہے۔ یہاں حکومت بکتی ہے، اسمبلی بکتی ہے، تھانہ بمعہ تھانیدار اور تحصیل بمعہ تحصیلدار بکتی ہے۔ ظلم ویسے ہی ہوتا ہے جیسے ڈوگرہ راج میں تھا صرف طریقے بدل گئے ہیں۔ بدکاری، مے خواری، برائی، بے حیائی رشوت خوری، اقرباء پروری، فرقہ پرستی، قبیلہ پروری، بددیانتی تم نے خود اپنائی ہے اور اسے حکومتی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ یہ سب ڈوگروں کے زمانہ میں نہیں تھا۔ ڈوگرے مسلمان سمجھ کر ظلم کرتے تھے جبکہ تمہاری آزاد حکومتیں تمہیں انسان سمجھ کر ظلم کرتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی عدل بھی کرتے تھے اور اولیاء کرام کی عزت کرتے تھے۔ تمہارے حکمران انہیں بدعت کے مراکز سمجھ کر ان کے نشانوں کو مٹانے کے درپے ہیں۔

ڈوگروں کا ظلم و ستم ان کے دھرم کا حصہ تھا۔ برادری ازم اور بلیک لیبل والوں کا ظُلم بے انصافی، کرپشن، برائی، بے حیائی، ہوس اور حرص کا شاخسانہ ہے۔ اس سے پہلے کہ بات بڑھ جاتی اور آنے والے طوفان کی جھلک دکھلائی جاتی میں نے آنکھ کھول دی اور من کی دنیا سے لوٹ آیا۔

ہاں! کرنل حق مرزا ٹھیک کہتے ہیں۔ حافظ صاحب نے سچ کہا۔ سلطان العارفین کا فیصلہ بھی درست ہے۔ آزادی کس لیئے اور کس کیلیئے۔ ابھی تو ہم آزادی کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ ہم تو غلامی کے عادی ہیں اور حاکم بھی ویسے ہی ہیں۔ ایک کافر تھا تو دوسرا منافق ہے۔ سلطان العارفین کس کے حق میں فیصلہ کریں۔ دونوں کے ہاتھ میں غلامی کی زنجیر ہے تو پھر ہم کیا چاہتے ہیں۔ صرف یہی کہ زنجیر گلے سے اتار کر پاؤں سے باندھ لی جائے۔ ہم عجیب آزادی چاہتے ہیں۔ کافروں سے آزاد ہو کر منافقوں، بدکرداروں، بے حیاؤں اور کرپٹ لیڈروں کی غلامی چاہتے ہیں۔ جب تک ہماری سمت درست نہیں ہوگی اور آزادی کا

مقصد اور مفہوم ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا، آزادی ہمارا مقدر نہیں بنے گی۔

جنگ آزادی کشمیر
1947-1948ء کی نمایاں خصوصیات

تخلیق کائنات کا ارتقائی مطالعہ انسانی فطرت اور نفسیات کا ایک ایسا روشن پہلو اجاگر کرتا ہے جسے سمجھے بغیر کوئی شخص قیادت و رہنمائی کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ انسانی تخلیق میں سب سے اہم جز و مٹی ہے جس کا انسان کے مزاج پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ مزاج شناسی در حقیقت انسانی نفسیات ظاہری و باطنی کا حصہ ہے کہ ایک شخص ایک گروہ یا ایک خطہ کے لوگوں کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھ کر انہیں کس طرح استعمال کیا جائے اور ان کے لطیف جذبات و احساسات کو مصرف میں لاکر ان سے بھرپور فائدہ حاصل کیا جائے۔

چنگیز خان کو جب منگولیا کے قبائلی سرداروں نے اپنا آقا و لیڈر مان لیا اور اسے اٹھارہ دُموں والا جھنڈا عطا کر کے خاقان اعظم کے خطاب سے نوازا تو چنگیز بجائے خوش ہونے کے غم زدہ ہوگیا۔ عالم غمناکی میں وہ اپنے خیمے میں وارد ہوا تو اس کی محبوب بیوی پرولتائی نے پوچھا کہ خوشی کے بجائے اس کے چہرے پر اداسی کیوں ہے؟ چنگیز جو کہ پیدائشی قائد اور جنگجو لیڈر تھا منگول خونخوار سرداروں کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ وہ پرولتائی کے پہلو میں بیٹھ گیا اور بولا۔ اے جان چنگیز تو جانتی ہے کہ ان لوگوں کی تلواریں ہمیشہ بے نیام رہتی ہیں، جنگ و جدل اور آوارہ گردی ان کا پیشہ ہے۔ بات بات پر لڑنا اور خون بہانا ان کی فطرت میں ہے۔ بھلا یہ بوڑھا کب تک ان کا خاقان اعظم رہے گا۔ آج نہیں تو کل یہ باہم لڑیں گے اور ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔

پرولتائی بھی ! خاقان اعظم سے کم نہ تھی۔ فوراً بولی اس سے پہلے کہ یہ باہم کشت و خون کا سلسلہ شروع کر دیں انہیں کسی طاقتور دشمن سے لڑادو اور ان کی قیادت کرو تا کہ ان کا مزاج بھی درست رہے اور تمہاری سلطنت بھی قائم رہے۔

چنگیز نے پرولتائی کے مشورہ پر عمل کیا اور اٹھارہ دُموں والا جھنڈا اٹھا کر چین پر حملہ کر دیا جو اس دور کی سب سے مضبوط اور طاقتور سلطنت تھی۔ یوں منگولیا کے خونخوار قبائل کی تلواروں کا رخ اندر کے بجائے باہر کی جانب ہو گیا اور چنگیز خاقان اعظم بنا رہا۔

مزاج شناسی میں سیاسی حکمت عملی کا بھی ایک پہلو ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بنے تو سلطنت اموی کی وسعت کا کوئی شمار نہیں تھا۔ ہر طرف خیر تھی مگر خلیفہ کو پریشانی لاحق ہوگئی چونکہ وہ خاندان بنواُمیہّ کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ لہذا مزاج شناس اور خداترس خلیفہ نے ملک میں اصلاحات کا نفاذ کیا اور اس کی ابتداء اپنے ہی گھر سے کی۔ ان اصلاحات کی وجہ سے خاندان بنواُمیہّ کی عیش وعشرت، آرام طلبی، جاہ وحشمت اور جاگیرداریوں کا تکبر ٹوٹ گیا اور صرف ڈھائی سالہ دور اقتدار میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دنیا میں ایک ویلفیئر سٹیٹ کی عمدہ مثال قائم کردی جہاں عدل وانصاف، مساوات و برابری، امن وسکون کا دور دورہ تھا اور بادشاہ اور عام آدمی کی معاشرتی اور معاشی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔

ترک قوم مزاجاً احسان مند ہے۔ کئی عشرے گزرے کہ کبھی تحریک خلافت نے ہندوستان میں جنم لیا تھا مگر ترک قوم آج بھی ہمیں محمد علی جوہر، بی اماں اور مولانا شوکت علی کی قوم سمجھ کر ہمارے ہاتھ چومتی اور ہمیں بھائی کہہ کر پکارتی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے ساری پاکستانی قوم کو افغان جہاد میں جھونک دیا اور آخر کار اسی جہاد کی بھینٹ چڑھ کر اس جہاں سے کوچ کر گئے۔ امریکہ نے

اپنے واحد دشمن سویت یونین کو افغانستان کے سیاہ پہاڑوں میں پاکستان کی مدد سے پھنسایا تو جنرل ضیاء الحق نے امریکہ سے صرف اپنے اور اپنے رفقاء کے بچوں کے بہتر مستقبل کی ضمانت لیکر سارے پاکستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔ جنرل ضیاء الحق اور ان کے مشیر چاہتے تو مصر کی طرح امریکی مزاج اور نفسیات سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے تھے مگر صرف چند ادھورے ایف سولہ طیاروں، کروڑوں ڈالر قرض اور امریکہ کی خوشی کی خاطر مرد مومن نے سویت یونین کا خاتمہ کیا تو امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر پھن پھیلا کر سامنے آ گیا جس کا پہلا نشانہ ضیاء الحق کی ذات اور ان کا ملک پاکستان بنا۔ سویت یونین کے خاتمے کے بعد دنیا میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے کوئی دوسری قوت ایسی نہیں جو امریکی تکبر کا مقابلہ کر سکے اور عالم اسلام کو امریکی اور اسرائیلی قوت اور یلغار سے بچانے کا موجب بنے۔ سویت یونین کی موجودگی میں لیبیا، یمن، عراق، شام اور ایران اسرائیل اور امریکہ کے لئے خطرہ تھے مگر اسرائیلی دہشت گردی اور فلسطینیوں کے قتل عام نے ساری اسلامی دنیا کی بے بسی اور مغلوبی عیاں کر دی ہے جس کا سہرا جنرل ضیاء الحق کے سر ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے جس طرح افغان عوام کی مدد کی اور اپنا سب کچھ افغانوں پر قربان کر دیا اس سے کوئی پاکستانی بے خبر نہیں۔ اس قربانی اور مہمان نوازی کے صلے میں پاکستانی قوم کو قرضوں کے انبار، ہیروئن اور افیون سے لدے ٹرک، راکٹ لانچرز، گرنیڈ، کلاشنکوفیں، گولہ بارود سمیت لاکھوں سماجی اور معاشرتی برائیاں تحفے میں ملیں۔ اس کے علاوہ افغان دوستی کی وجہ سے پاکستان پر بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے الزامات عائد کر کے عالمی اداروں نے پاکستانی قوم کو غربت و افلاس میں مبتلا کرنے کے نت نئے بہانے بھی ڈھونڈ

لئے۔

گیارہ ستمبر 2001ء کے واقعات کے بعد افغانستان میں حکومت بدلی تو افغان قوم کے عتاب کا پہلا نشانہ بھی پاکستان ہی بنا۔آج کی مہذب دنیا میں افغان ایک ایسی قوم ہے جس کے خودساختہ جرنیلوں نے ہزاروں پاکستانی برائے فروخت اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں جو کہ افغان قوم کی شکر گزاری کی عمدہ مثال ہے۔افغان جرنیل اور وزیر حسب ضرورت یہ پاکستانی بھارت کو بھی فروخت کرتے رہتے ہیں تاکہ بھارت نت نئی چالبازیوں کے لئے ان پاکستانیوں کو استعمال کر کے پاکستان کو بدنام کرنے اور پاکستان کے خلاف عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کا ذریعہ بناتا رہے۔

اس سے پہلے کہ تحریک آزادی کشمیر اور اہلیان کشمیر کے مزاج کا ذکر کروں ان واقعات کا ذکر اہل وطن کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں چونکہ ان سے پاکستان اور کشمیر کا ہر غریب براہ راست متاثر ہے۔ پاکستانی قوم اور حکمرانوں کی افغان نوازی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے مگر اس کے بدلے میں افغان قوم اہلیان پاکستان کی چنداں شکر گزار نہیں بلکہ جو کچھ پاکستان سے ہاتھ لگے اسے افغان اپنا حق اور غنیمت سمجھتے ہیں۔افغان بحیثیت قوم احسان فراموش اور آزاد طبع لوگ ہیں جو کسی دوسرے کی ہمدردی اور احسان مندی پر یقین ہی نہیں رکھتے۔افغان چاہے امیر ہو یا فقیر اور مفلوک الحال،اس کے نزدیک پاکستان وسیلہ معاش اور پاکستانی حقیر ہے۔ وہ اپنے آپ کو احمد شاہ ابدالی،محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی اولاد سمجھتا ہے جنہوں نے اہل ہند کو مغلوب کیا،ان کی دولت چھینی اور ان پر حکومت کی۔اگر حقیقت کے آئینہ میں دیکھا جائے تو ہمارا کوئی فطری اثاثہ بھی تو نہیں۔افغان ہمیں جن کی غلامی کا طعنہ دیتے ہیں ہمیں انہیں پر فخر ہے۔

پاکستانی حکمرانوں اور اہل دانش وحکمت کی نفسیات اور مزاج کا جس طرح آزاد

کشمیر کے سیاسی طبقہ نے تجزیہ کیا ہے وہ بھی ایک تاریخی مثال ہے۔مشرف دورحکومت میں پاکستان وآزادکشمیر میں احتساب کے محکمے بنے تو لوگوں کو شک گزرا کہ شائد آزادکشمیر سے سیاسی آلودگی کا خاتمہ ہوجائے اور چند سالوں میں ارب پتی بننے والے کرپٹ سیاسی عناصر پرحکومت گرفت کرکے آزادکشمیر کےعوام پر احسان کرے اورانہیں بدعنوان عناصر کی غلامی سے نجات دلوائے۔شروع شروع میں احتساب کا خوف اس قدر سخت تھا کہ بہت سے بدعنوان اورکرپٹ لوگ بیرون ملک بھاگ گئے اوراپنی دولت ہنڈی کے ذریعے دوسرے ملکوں میں شفٹ کردی۔پھران نبض شناسوں نے پاکستانی حکمرانوں کےمزاج کو جانچا اور انہیں باورکروانے میں کامیاب ہوگئے کہ یہ دولت ہم نے برطانیہ میں ٹیکسی ڈرائیوری،خوانچہ فروشی،بیرہ گیری،دودھ فروشی اورسبزی فروشی کے ذریعے کمائی ہے۔

اہل اقتدار جب اس بات پر کچھ متفق نظر آئے تو نبض شناس سیاسی لٹیروں نے انہیں یورپ اورامریکہ میں دعوتیں دیں اورانہیں نہ صرف رام کرلیا بلکہ یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگران پر ہاتھ ڈالا گیا تو پاکستان کی کشمیر پالیسی کوسخت نقصان پہنچے گا۔اہل اقتدار جوکسی نہ کسی بہانے اپنے ان دوستوں کے جرائم پرآنکھ بند کرنا چاہتے اورانہیں آزادانہ کشمیری قوم کی بیخ کنی کا سرٹیفکیٹ دینا چاہتے تھے نے آخری تجویز کو بھی مان لیااورآزادکشمیر کےمعاملات کو خدا پرچھوڑتے ہوئے اسے اپنی کشمیر پالیسی کا حصہ بنالیا۔حکمرانوں نے اس خیال کوحقیقت تسلیم کرلیا کہ کرپٹ سیاسی گھرانوں اوران کے حمائیتوں پر ہاتھ ڈالنے سے کشمیر کاز کونقصان پہنچے گا اس لئے احتساب بیورو کے دفتر پر قفل لگا کر اسے شملہ معاہدے کی طرح سردخانے کی نذرکردیا۔آزادکشمیر میں پاکستانی سیاستدانوں اورجرنیلوں نے احتساب کےعمل کوغیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کرکے کشمیر کاز کوتقویت بخشی اوراپنے اپنے حصے کی بلیک لیبل بوتلیں اور ڈالروں کی تھیلیاں لےکر خاموش ہوگے۔

تحریک آزادی کشمیر 48-1947ء درحقیقت تحریک حصول پاکستان ہی کا حصہ تھی جس کا برملا ذکر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں کیا۔ قائداعظمؒ کی کشمیر کے متعلق سوچ ہی کا اثر تھا کہ تحریک آزادی میں حکومت پاکستان کو چھوڑ کر قائد اور ان کی قوم اہلیان کشمیر کی مصیبتوں پر چلا اٹھے اور جو کچھ بن پایا پاکستانی قوم نے حکومت کی مرضی ومنشاء کے خلاف اہل کشمیر کی مدد کے لئے کیا۔

تحریک آزادی کشمیر بغیر کسی تعصب اور لالچ کے الحاق پاکستان کی تحریک تھی جس کا عملی مظاہرہ کشمیر کی مٹی سے ہی ہوا۔ تب اس تحریک کو کوئی بیرونی امداد حاصل نہیں تھی چونکہ اس کا تعلق کشمیریوں کے جذبات واحساسات سے تھا اور یہ تحریک حقیقی معنوں میں جہاد آزادی تھا۔ کشمیر کی مٹی کی خاصیت اور کشمیریوں کی تحریک آزادی کے مزاج کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہوسکتی ہے کہ پچاس سال گزرنے کے باوجود پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں اور نوکرشاہی نے کشمیر اور کشمیریوں کو کوئی اہمیت نہیں دی مگر اس کے باوجود کشمیری قوم پاکستانی حکومتوں اور نوکرشاہی کے امتیازی سلوک اور سوتیلے پن کے باوجود کشمیر بنے گا پاکستان اور پاکستان سے رشتہ کیا لاالہ الا اللہ کے نعرے لگاتے ہر روز اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

پاکستانی حکمران طبقے کے دلوں کے بغض اور امتیازی سلوک پر اگر لکھا جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب مرتب کی جاسکتی ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سوالوں اور مثالوں کا جواب کسی پاکستانی حکمران کے پاس نہیں۔ پاکستانی حکمرانوں کی کشمیریوں سے نفرت اور بغض کی بھی ایک داستان ہے۔ جبر وظلم دراصل اُن حکمرانوں کا وطیرہ ہوتا ہے جن کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں ہوتا اور وہ ظلم کے ذریعے ہی اپنے خلاف اٹھنے والی آواز کو دباتے ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان نے کشمیر کے لئے دو جنگیں لڑیں اور موجودہ

تحریک آزادی کو سپورٹ کیا وہ ان جنگوں اور موجودہ سپورٹ کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ جب حقائق سے پردہ اٹھے گا تو شاید وقت کا پہیہ اتنا گھوم چکا ہوگا کہ بہت سے سوالات قصہ ماضی بن کر بے جواب ہو چکے ہوں گے۔

اس سلسلہ کی چند زندہ مثالیں تحریک آزادی کشمیر 48-1947ء کو مقامی بغاوت سمجھ کر اس کی سپورٹ نہ کرنا ہے جس میں ہلال کشمیر کی پہچان سے انکار سے لیکر احتساب بیورو کی بے بسی تک کا نام دونگا۔ اس دوران کے چند واقعات آزاد کشمیر کے لوگوں پر جبری عبوری آئین کا نفاذ اور کشمیر کونسل جیسے لوٹ مار کے ادارے کا قیام، جنگلات کی بے دریغ کٹائی اور قدرتی اثاثوں کی تباہی، منگلا ڈیم کی رائیلٹی سے محرومی آزاد کشمیر کے عوام کو انجینئرنگ، میڈیکل اور یونیورسٹی کی تعلیم سے محرومی، ذرائع ابلاغ یعنی معیاری ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے محرومی جیسے درجنوں واقعات ہیں جن پر کبھی کسی پاکستانی حکومت نے غور نہیں کیا۔ ان پچاس سالوں میں اگر آزاد کشمیر کی طرف دیکھا جائے تو حکومت پاکستان نے ہمیشہ وہاں اپنی پسند کے لوگوں کی حکومتیں بنوائیں اور پھر انہیں کشمیری عوام کو دبائے رکھنے اور عیش و عشرت کی کھلی چھٹی دی۔

تحریک آزادی کشمیر اور کشمیریوں کے پاکستان نواز مزاج کی کہانی ویسی ہی ہے جیسے پاکستان اور پاکستانیوں کی افغان نواز پالیسی اور مزاج ہے۔ افغانی چاہیں تو پاکستان کو لاکھ برا بھلا کہیں، پاکستانیوں کو پکڑ کر بیچیں، ملکی وسائل کو لوٹیں، بھارت کے ساتھ ملکر پاکستان کا امن تباہ کریں مگر پاکستانی مزاج ایسا ہے کہ وہ سب کچھ بھول کر ہر مشکل میں افغانوں کی مدد کو پہنچیں گے۔

1948ء میں جب کشمیری مجاہدین اپنے ہی فتح کئے ہوئے علاقوں میں بے سروسامانی کی حالت میں پڑے تھے اور وہ پاکستانی قائدین سے مدد کی بھیک مانگ رہے

تھے، چونکہ شدید موسمی حالات اور پوری طرح مسلح دشمن انہیں برابر دھکیل رہا تھا مگر پاکستان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ ابتداء میں کچھ پاکستانی فوجی افسر وہاں پہنچے تو انہوں نے مجاہدین کا حوصلہ، ہمت اور جذبہ دیکھ کر جی ایچ کیو سے امداد کی اپیل کی مگر کسی نے ان کی درخواست کا جواب نہ دیا۔ جب اصرار بڑھ گیا تو ان افسروں پر ایسے افسر تعنیات کئے گئے جو امداد کے بجائے پس قدمی کا منصوبہ لیکر گئے اور مجاہدین کو مدد مہم پہنچانے کے بجائے انہیں فتح کئے ہوئے علاقے خالی کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

لیفٹیننٹ کرنل ایم۔اے۔حق مرزا اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ ستمبر، اکتوبر اور نومبر کے مہینے ہمارے لئے بہت سی پریشانیاں لیکر آئے۔ کشمیری مجاہدین جو کہ بے سروسامانی کی حالت میں بھارتی فوج سے لڑ رہے تھے کو امید تھی کہ قائداعظمؒ کسی نہ کسی طرح فوج کو کشمیر میں لڑنے اور مجاہدین کی امداد کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیں گے مگر گیارہ ستمبر 1948ء کو اطلاع ملی کہ قائد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ یہ خبر مجاہدین پر بجلی بن کر گری اور ہمارا حوصلہ اور ہمت جواب دے گئی۔ ہر مجاہد دوسرے سے پوچھنے لگا کہ اب تو ہماری مدد کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔ ابھی ہم قائداعظمؒ کی رحلت کا دکھ بانٹ ہی رہے تھے کہ دوسری خبر ملی کہ بھارت نے حیدرآباد دکن پر قبضہ کرلیا ہے۔ امید تھی کہ حیدرآباد میں کشمیر کی طرح بغاوت ہوگی اور اتنا خون بہے گا کہ بھارت کو کشمیر بھول جائے گا مگر مزاجاً حیدرآباد دکن اور جوناگڑھ والوں کو پاکستان سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لئے ایسا کچھ نہ ہوا جس سے بھارت کو پریشانی لاحق ہوتی۔ اور تو اور 23 سال پاکستان کے ساتھ رہنے والے الگ مزاج بنگالی بھی گزارہ نہ کر سکے اور 23ویں سالگرہ سے پہلے ہی اپنا ٹھکانہ الگ کرلیا۔

اکتوبر 1948ء میں جب برف باری کا سلسلہ شروع ہوا تو حالات اور بھی ابتر ہو گئے۔ وادی سرن، درہ پیر پنجال اور ملحقہ چوٹیوں پر برف کی پہلی پھوار پڑتے ہی دشمن نے

توپوں، ہوائی جہازوں اور زمینی دستوں کا دباؤ بڑھا دیا۔ کرنل مرزا لکھتے ہیں کہ ہمارے محسن اور مجاہدین سے ہمدردی رکھنے والے پاکستانی کمانڈر میجر انور کمال جنہیں کرنل اکمل بنا کر ہماری مدد کے لئے بھیجا گیا تھا نے جی ایچ کیو کو پیغام بھجوایا کہ کچھ باقاعدہ فوج مجاہدین کی مدد کے لئے بھجوائی جائے تاکہ مجاہدین کو دفاعی جنگ سے نکال کر آگے بھجوایا جائے اور وہ دشمن پر گوریلا کاروائیاں کر کے دشمن کی پیش قدمی کو روکیں۔ میجر انور کمال نے یہ بھی مشورہ دیا کہ پونچھ شہر کا محاصرہ کرنے والوں کی کمان کسی ریگولر افسر کو دی جائے اور اسے باقاعدہ نفری کے ذریعے کنٹرول کیا جائے چونکہ اس سے قبل باہمی نفاق اور جرالوں کی کوتاہیوں کی وجہ سے راجوری کا محاصرہ توڑ کر دشمن نے راجوری پر قبضہ کر لیا تھا۔ میجر انور کمال جن کا تعلق 13 لانسر سے تھا کی اچھی باتیں جی ایچ کیو کو پسند نہ آئیں اور بجائے فوج اور اسلحہ بھیجنے کے جی ایچ کیو نے میجر انور کمال کی جگہ فسٹ پنجاب کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل وحید حیدر کو جنرل ہلاکو کا خطاب دیکر مینڈھر سیکٹر کا انچارج یعنی سیکٹر کمانڈر لگا دیا جنہوں نے آگے بڑھنے کے بجائے فتح کئے ہوئے علاقے بھی بھارت کے حوالے کر دیئے۔ اس بات کا ذکر کرنل حق مرزا کی ڈائری سے ماخوذ کتاب (وورنگ چنار) کے صفحہ 150 سے 166 تک کیا گیا ہے۔
جنرل ہلاکو کی آمد سے پہلے کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی روح اور مزاج سمجھنے والے میجر کمال نے حیدری فورس کو تین حصوں میں تقسیم کر کے حیدری 1، حیدری 2 اور حیدری 3 کے نام سے تین بٹالین کی بنیاد رکھی تاکہ جی ایچ کیو سے ان کی درخواست پر مثبت ردعمل کی صورت میں پہلے سے تیار شدہ ڈھانچے کو وقت ضائع کئے بغیر عملی جامہ پہنا دیا جائے اور حیدری بریگیڈ کی صورت میں ایک فورس درہ پیر پنجال سے راجوری اور نوشہرہ تک کے علاقہ پر گرفت حاصل کرے۔ اس سلسلہ میں حیدری 2 جو کہ کل چھ پلاٹون پر مشتمل تھی کی سب سے اہم اور نفری کے لحاظ سے بڑی پلاٹون نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کی تھی جس کی نفری میں

نائیک سیف علی نے اپنے طور پر اضافہ کیا۔

قارئین کی معلومات کے لئے گزارش ہے کہ مجاہدین کے بریگیڈ، بٹالین، کمپنیاں اور پلاٹونیں فوجی خطوط اور ترتیب کے لحاظ سے نہیں تھیں بلکہ انہیں ریٹائرڈ فوجیوں نے اپنے طور پر نام دیئے ہوئے تھے۔ بہت سے ریٹائرڈ صوبیداروں، صوبیدار میجروں اور اعزازی لفٹینوں اور کپتانوں نے اپنے ناموں کے ساتھ کیپٹن، میجر اور کرنل کے رینکوں کا اضافہ بھی کر لیا اور بعد میں حالات کے دھارے نے انہیں ان ہی عہدوں پر برقرار رکھا۔ مگر حقیقت میں دوران جنگ ان کرنیلوں، میجروں کے پاس پچاس آدمی بھی نہیں تھے۔

کچھ درویش صفت ایسے بھی تھے جن کی قیادت میں تو بہت سے مجاہد تھے مگر انہوں نے کسی مالی فائدے اور ظاہری نمود و نمائش کے لئے خود ساختہ عہدوں کی نہیں بلکہ جہاد کی اصل روح یعنی مقام شہادت کی تمنا کی اور ربّ ذوالجلال نے انہیں اسی مقام کے لئے چن لیا۔ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید بظاہر تو پلاٹون کمانڈر تھے مگر چھ پلاٹونوں کی بٹالین میں سب سے زیادہ نفری انہوں نے خود جمع کی جس میں ان کی اپنی برادری اور قبیلے کے لوگوں کا زیادہ حصہ تھا۔

یہ لوگ یعنی مجاہدین نہ تو حکومت کے تنخواہ دار تھے اور نہ ہی انہیں کوئی اور مراعات ملتی تھیں۔ اللہ کے یہ نیک بندے جذبہ جہاد اور جذبہ شہادت سے سرشار آزادی کی تمنا لیکر نکلے تھے اس لئے وہ اسی کمانڈر کے ساتھ رہنا پسند کرتے جو حکومت آزاد کشمیر کی تشکیل میں حصے داری کا نہیں بلکہ آزادی کشمیر کا خواہاں ہوتا۔ نائیک سیف علی جنجوعہ نے ابتداء میں مینڈھر کے علاقہ میں جو جہادی کاروائیاں کیں ان کا ذکر بھی کسی نے نہیں کیا چونکہ حکومت اور میڈیا میں ان کی برادری کا اثر ورسوخ نہیں تھا۔ حالانکہ ان کی یہ پلاٹون جس کی نفری سے ہی بعد میں بٹالین بن گئی مینڈھر میں متعدد مقامات پر عرصہ تک لڑتی رہی۔

جب راقم نے شہید کی بیوہ سے ان کے دیگر معرکوں اور مجاہدین کی تربیت کے حوالے سے ذکر کیا تو محترمہ زہرہ بی بی نے بتایا کہ شہید سیف علی خاموش طبع انسان تھے۔ شاید قدرت کو ان کی تشہیر منظور نہ تھی اسی لئے کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ شہید کے دیگر کارناموں کا بھی ذکر کرتا۔ پھر کہنے لگیں کہ اس دور میں وہ لوگ کسی ایک جگہ پر تو رہتے نہیں تھے۔ سردار صاحب (سردار فتح محمد خان کریلوی) انہیں کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف بھیجتے۔ جس نالے یا چوٹی پر ڈوگروں کا اجتماع ہوتا کسی نہ کسی کو ان کی سرکوبی کے لئے جانا پڑتا۔ سیف علی واحد کمانڈر تھے جو ہر لمحے اپنے آپ کو تیار رکھتے اور لوگوں کو جمع کر کے ڈوگروں پر حملہ آور ہوتے۔

زہرہ بی بی کے مطابق ابتدائی دنوں میں سیف علی شہید کے پاس ایک رائفل اور تلوار تھی جو کہ ان کے گھر میں پہلے سے موجود تھی۔ تھانے والوں نے تلوار اور بندوق جمع کروانے کا حکم دیا تو ہم نے دونوں ہتھیار سردار صاحب (سردار فتح محمد خان کریلوی) کے پاس جمع کروا دیئے۔ سردار صاحب کا حکم تھا کہ کوئی آدمی اپنا ہتھیار ڈوگرہ پولیس کو نہ دے بلکہ سردار صاحب کے پاس لے آئے۔ اپنے ہتھیار جمع کروانے کے بعد سیف علی شہید نے دوسرے لوگوں کو بھی سمجھایا کہ ڈوگرے ہتھیار چھین لیں گے اس لئے ہتھیار سردار صاحب کے پاس جمع کروا دیئے جائیں۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سردار صاحب نے سیف علی جنجوعہ کو کچھ ہتھیار دیئے اور پھر بہت سے لوگ سیف علی کے پاس آنے لگے جنہیں لیکر وہ مینڈھر چلے گئے۔

زہرہ بی بی کہتی ہیں کہ ان کے شہید شوہر لوگوں کو کہتے کہ ہمت کرو۔ اپنا علاقہ نہیں چھوڑنا بلکہ دشمنوں کو یہاں سے بھگانا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد یہاں پر بھی قائداعظمؒ کی حکومت ہوگی۔

قارئین محترم:۔

جہاد آزادی اور تحریک آزادی کشمیر تو خالصتاً پاکستانی مزاج رکھتی تھی مگر پاکستانی حکومتوں نے کشمیریوں کے مزاج کی قدر نہیں کی۔ پاکستانی قیادت ہمیشہ آزاد کشمیر میں بننے والی حکومتوں میں دلچسپی لیتی رہی اور عوام کو کبھی اہمیت نہیں دی جس کی وجہ سے کشمیریوں کا مزاج بھی وہ نہیں رہا جس کی واحد امین زہرہ بی بی ہیں۔ وہ تھرڈ آپشن کی نہیں بلکہ قائد اعظمؒ کی حکومت کی بات کرتی ہیں اور اسی کی منتظر ہیں۔ زہرہ بی بی کو حکومتوں اور حکمرانوں سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ وہ اپنے خاوند کے کارناموں کی تشہیر بھی نہیں چاہتی چونکہ شہادت کسی تشہیر کی محتاج نہیں۔ یہ بندے اور ربّ کا معاملہ ہے اور شہید کا انعام اللہ کے پاس ہے۔

اے کاش! ان شہیدوں کی میراث کے مالک اور ان کے خون کی کمائی کھانے والی آزاد حکومتوں کو بھی اس کا خیال آئے کہ شہید تو اپنا مقام پا گئے مگر ان کے خون سے بے وفائی کرنے والوں کا اللہ کے نزدیک کیا مقام ہوگا؟۔

فتح شکست میں بدل گئی

48-1947ء کی جنگ آزادی بنیادی طور پر تحریک پاکستان سے مطابقت رکھتی تھی مگر پاکستانی عوام کی طرح حکومت پاکستان نے کشمیر کے معاملے میں جو سرد مہری دکھائی اس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔ بھارتی افواج کے سرینگر پہنچنے کے بعد پاکستانی حکمرانوں کے پاس اس بات کا جواز نہیں تھا کہ اگر پاکستان کشمیر میں مداخلت کرے تو بھارت حملہ کر دے گا۔ جب بھارت حملہ کر چکا تھا اور اپنے آپ کو پنجرے میں ڈال چکا تھا تو پھر پاکستان کو خدا نے موقع دیا تھا کہ وہ پنجرے کا دروازے بند کر دے۔ بجائے قبائلیوں کو سرینگر بھیجنے کے انہیں جموں کی طرف بھجوایا جاتا اور بھارت کا زمینی راستہ بند کر دیا جاتا مگر غلامانہ ذہنیت کی حامل بیوروکریسی نے سوتے ہوئے انگریز کو بھی دیوتا سمجھا اور اس کی اجازت کو خدا کی مرضی سمجھ کر تابعداری کے اصولوں کو خدائی احکامات سمجھ کر ان پر عمل پیرا رہی۔

جیسا کہ متعدد بار بیان ہوا ہے کہ انگریز افسروں میں چند جرنیل، کچھ بریگیڈیئر، کرنل اور میجر تھے جن کی خدمات پاکستان آرمی نے برطانوی حکومت سے مستعار لے رکھی تھیں۔ انگریز سٹور کیپر، دربان، کلرک، موٹر ڈرائیور نہیں تھے اور نہ ہی ہتھیاروں اور ایمونیشن کے سٹوروں کی چابیاں ساتھ لیکر سوتے تھے۔ اگر پاکستانی افسر چاہتے تو ہتھیاروں کی بڑی کھیپ مجاہدین کو بھجوا سکتے تھے۔ اس جہاد کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ مجاہدین مقامی اور تربیت یافتہ فوجی تھے جو دوسری جنگ عظیم ان ہی ہتھیاروں سے لڑ چکے تھے جو پاکستان آرمی کے پاس تھے۔ یہ سابقہ فوجی جن کی تعداد ساٹھ ہزار سے زائد تھی کی موجودگی میں

قبائیلوں کی بھی ضرورت نہیں تھی مگر غلامانہ ذہنیت نے حکمرانوں کی سوچ کو مفلوج کر دیا اور کسی کی ہمت نہ ہوئی کے وہ نہتے کشمیریوں کی مدد کرے۔

ابتدائی جوش و جذبے کے بعد یہ جنگ جلد ہی علاقائی صورت اختیار کرگئی اور مجاہدین کمانڈروں کے باہمی اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ بہادری کی جھوٹی کہانیوں اور داستانوں نے جنم لینا شروع کر دیا اور پھر ہر کسی نے جلدی جلدی اپنے بریگیڈ اور بٹالین بنالیں تا کہ حکومت پاکستان سے ملنے والی خیرات سے اپنا پیٹ اور رتبہ بڑھایا جائے۔ مجاہدین جب برف پوش پہاڑوں پر بے سروسامانی کی حالت میں لڑ رہے تھے تو ان کیلئے پاکستانی عوام کی طرف سے جمع کیا ہوا راشن، گرم کپڑے اور ادویات پنڈی کے بازاروں میں بک رہی تھیں۔ حکومت پاکستان نے 1948ء کے وسط میں جو تھوڑا بہت اسلحہ و ایمونیشن بھجوایا وہ بھی چند نامی گرامی شخصیات نے قبضے میں لے لیا اور اگلے مورچوں پر لڑنے والوں کی کوئی مدد نہ کی۔

بدقسمتی کا ایک اور تھپڑ حکومت پاکستان کی طرف سے یوں لگا کے ابتدائی دور میں جو فوجی افسر مجاہدین کی رہنمائی کے لئے آئے اور پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ تکالیف برداشت کرتے رہے انہیں ایک سخت گھڑی میں یعنی جب بھارتی افواج پوری قوت سے حملہ کرنے لگیں تو ان افسروں کو تبدیل کر دیا گیا۔ بعد میں آنے والوں نے مجاہدین کو صرف پس قدمی کی ترغیب دی اور فتح کئے ہوئے علاقے بھی بھارت کے حوالے کر دیئے۔

ستمبر 1948ء میں جب مون سون عروج پر تھا تو بھارت نے پوری قوت لگا کر راجوری سے مجاہدین کو نکال دیا۔ یہاں فوجی افسروں اور مقامی جرال قبیلے میں اختلافات پیدا ہوئے جس کا فائدہ محصور ڈوگرہ فوج نے حاصل کیا۔ ڈوگروں نے جرال سرداروں اور سٹیٹ آرمی کے افسروں کی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارتی فوج کو محفوظ راستوں سے آگاہ

کیا۔سردار فتح محمد خان کریلوی کی طرح راجوری کے جرالوں کے سردار ذیلدار محمد خان جرال نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح جرال سرداروں اور فوجی افسروں کے اختلافات ختم ہو سکیں مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ذیلدار صاحب نے اس قضیے کو ختم کرنے کیلئے جی ایچ کیو آزاد کشمیر کو بھی آگاہ کیا اور حکومت پاکستان کے نمائندوں سردار شوکت حیات، جنرل اکبر خان، خان عبدالقیوم خان اور وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کو متعدد خطوط بھجوائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

یکم اکتوبر 1948ء کی رات بھارتی افواج نے تھانہ،شاہ درہ، گھمبیر اور رتن پیر کی پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا۔ دو اکتوبر کو وقت ضائع کئے بغیر بھارتی بریگیڈ کمانڈر نے تازہ کمک منگوا کر درہ پیر پنجال پر قبضہ کیا اور دریائے سورن کے ساتھ ساتھ وادی سورن میں پیش قدمی شروع کردی۔

19 اکتوبر کی رات وادی سورن میں موسم کی پہلی شدید برف باری نے مجاہدین کے لئے پیر پنجال اور وادی سورن میں رہنا مشکل کردیا جبکہ دشمن نے موسم کی شدت سے فائدہ اٹھا کر ڈھوری ماحل جو کہ تھانہ سے مغرب یعنی مینڈھر کی جانب دوسری دفاعی لائن تھی پر قبضے کے لئے حملہ کردیا۔اسی دوران پونچھ شہر کا محاصرہ کرنے والوں نے بھی بوریا بستر لپیٹا اور چاند ٹیکری اور چڑی کوٹ کی بلندیوں پر بیٹھ کر پونچھ شہر کا نظارہ کرنے لگے۔

نوشہرہ سیکٹر میں بھی حالات بدل گئے۔حکومت پاکستان کی طرف سے بھجوائے گئے لشکریوں اور مقامی سدھن بریگیڈ کمانڈر میں اختلافات پیدا ہوگئے۔دیری اور افغان لشکری کمانڈر اپنے آپ کو جرنیل سمجھتے تھے اور ہر چیز کو غنیمت سمجھ کر اس پر اپنا حق جتلاتے تھے۔ نوشہرہ سیکٹر کے مجاہد کمانڈر لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان شہید کے لئے دونوں دھڑوں کی لڑائی نے بہت سی مشکلات پیدا کردیں چونکہ سدھن بریگیڈ اور دیری لشکری انہیں اپنے زیر کمان رکھنا

چاہتے تھے۔یہی حال اسلحہ وایمونیشن کا تھا جبکہ دونوں فوجوں کی خوراک کا بندوبست مقامی ذیلدار خود کرتے تھے۔

لشکریوں کا رویہ مقامی آبادی سے انتہائی سخت اور حکمرانہ تھا۔وہ خواتین کی بے حرمتی کرتے اور لوگوں سے مال مویشی زبردستی چھین لیتے۔لشکریوں کے اس رویے سے سراہ،کھمبا اور ملحقہ دیہاتوں کی گجر آبادی سب سے زیادہ متاثر ہوئی تو گجر قبیلہ لشکریوں کے خلاف ہوگیا۔کہتے ہیں کہ ایک گوجری مائی نے اپنے بیل کا بدلہ لینے کے لئے بھارتی فوجی کمانڈر سے رابطہ کیا اور لشکریوں کے ٹھکانوں سے بھارتی فوج کو آگاہ کرکے نوشہرہ کے گرد بیٹھے لشکریوں کا خاتمہ کروادیا۔نوشہرہ کے بعد بھارتی فوج کیری تک پہنچی مگر لیفٹیننٹ راجہ مظفر خان شہید نے مقامی سازشوں کی پرواہ کئے بغیر دشمن کا مقابلہ جاری رکھا اور آخرکار اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے مقام شہادت پایا۔اکتوبر کے آخری ہفتے میں مینڈھر سیکٹر کی حالت مزید ابتر ہوگئی۔دشمن نے ہوائی جہازوں اور ہلکے ٹینکوں کا استعمال شروع کردیا چونکہ دسمبر سے پہلے وہ مجاہدین کا صفایا کرنا چاہتا تھا۔دس اکتوبر کو دشمن نے بڑا حملہ کرکے دھری ماہل پر قبضہ کیا تو اس کا اگلا حدف پیرکلیوا،بھمبرگلی اور پیر سید فاضل تھے جو کہ مینڈھر پر قبضے کے لئے دشمن کا آخری حدف تھا۔

مظفر آباد سیکٹر میں جان بوجھ کر مقامی آبادی کو جہاد میں شامل نہیں کیا گیا چونکہ ابتداء ہی میں یہاں لشکریوں نے قبضہ کیا۔وہ گاڑیوں پر بیٹھ کر مظفر آباد آئے اور مظفر آباد پر قبضے کے بعد گاڑیوں پر بیٹھ کر بارہ مولا اور پھر سری نگر کے قرب وجوار تک پہنچ کر بھارتی فوج کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔یہاں پر بھی لشکریوں اور مقامی آبادی میں بدمزگی پیدا ہوئی جس کا بنیادی عنصر خواتین کی بے حرمتی اور غنیمت کا حصول تھا۔یہ لشکری آزاد منش لوگ تھے جو کسی کی کمان میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔جب لشکریوں پر دشمن کا دباؤ بڑھا تو وہ جن گاڑیوں

میں بیٹھ کر آئے تھے انہیں میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ اگر ہمارے قائدین اور آزادی کے چمپیئن کوئی بہتر منصوبہ بندی کرتے تو وہ ببے اور کھکھے راجپوتوں کو جو سال ہا سال تک اس علاقہ میں ڈوگروں کے خلاف نبرد آزما رہے تھے انہیں جہاد میں شامل کرتے نہ کہ ان کی تذلیل کے لئے لشکری بلالاتے۔

معرکہ پیر کلیوا

بڈھا کھنا، پیر کلیوا، دراوہ اور بھمبر گلی کی پہاڑیاں شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً کچھ اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ یہ ایک دوسرے کی حفاظت بھی کرتی ہیں اور جدا جدا بھی ہیں۔ ندی نالوں کے ذریعے باہم ملی ہوئی قدرت کا شاہکار یہ پہاڑیاں عمودی نہیں بلکہ چپٹی ہیں اور چڑھائی کے اختتام پر ایک سطح مرتفع کا منظر پیش کرتی ہیں۔ علاقہ کی بناوٹ اور زمینی خدوخال کی وجہ سے یہ پہاڑیاں دشمن کے لئے وبال جان بنیں اور ان پر بیٹھے اللہ کے مجاہدوں نے چن چن کر دشمن مارے اور ان کی قوت کو پاش پاش کر دیا۔

دشمن کا منصوبہ

دشمن نوشہرہ اور راجوری پر قبضے کے بعد تمام چھینے ہوئے علاقے واپس لینے کی جستجو میں تھا چونکہ تب تک حکومت پاکستان نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کشمیر میں فوجی مداخلت کی جائے یا کہ نہیں۔ جو کمانڈر اور فوجی دستے پونچھ مینڈھر، مظفر آباد اور بھمبر میں آئے تھے انہیں بھی حکم ملا تھا کہ وہ کسی قسم کی جنگی کاروائیوں میں حصہ نہیں لیں گے بلکہ جو کچھ مجاہدین کریں صرف اس کی رپورٹ حکومت پاکستان کو بھجوائیں۔

ظاہر ہے کہ جب میدان خالی ہو اور لڑنے والے کمزور اور ناتواں ہوں اور دیکھنے والے فیصلہ کرنے کی ہمت سے عاری گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوں تو دشمن اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھائے۔ چنانچہ دشمن نے بڈھا کھنا اور پیر کلیوا کا علاقہ ایک بھرپور کاروائی کے لئے منتخب کیا۔ اس منصوبہ کی کامیابی سے دشمن کو خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا چونکہ مینڈھر کو قبضہ میں لینے کے بعد وہ تین سمتوں میں پھیل کر مجاہدین کی کامیابیوں کو سردست ناکامی میں بدل سکتا تھا۔ مینڈھر کی فتح اور اسے مستقر بنا کر وہ ایک ہی وقت میں کوٹلی، کھوئیرٹہ اور شمال میں ہجیرہ کی طرف پیش قدمی کرتا اور عقب سے ہوتا ہوا آزاد کشمیر کے تمام علاقوں کو ایک دوسرے سے کاٹ کر غیر محفوظ کر دیتا۔

دشمن کے حملے کا آغاز

26 اکتوبر کی صبح دشمن نے ایک انفنٹری بریگیڈ جسے توپخانے، بکتر اور فضائیہ کی بھر پور مدد حاصل تھی بڈھا کھنا پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت حیدری بٹالین کی ایک ایک پلاٹون بڈھا کھنا، دراوہ، پیر کلیوا اور بھڑوٹ گالہ پر دفاع لئے ہوئے تھی اور چاروں پلاٹون کمانڈر آزادانہ اپنے اپنے دفاعی منصوبہ کے مطابق جنگ لڑ رہے تھے۔ وائرلیس اور ٹیلی فون کا کوئی جدید اور موثر نظام بھی نہ تھا کہ کمانڈنگ آفیسر لحہ بہ لحہ بدلتے حالات کے مطابق اپنے ان کمانڈروں کو کچھ ہدایات دیتے یا پھر کسی ناگہانیت کی صورت میں انہیں مزید کمک بھیجتے۔ پیغامات بھیجنے کا واحد ذریعہ چٹھی رسانی تھا مگر دشمن ان پہاڑیوں اور ندی نالوں کے انچ انچ پر بمباری کر رہا تھا۔ پہلے مرحلے میں دشمن نے تین اطراف سے بڈھا کھنا پر حملہ کیا اور سارا دن شدید لڑائی میں گزرا۔ اس دوران پیر کلیوا، دراوہ اور بھڑوٹ گالہ پر دشمن کے ہوائی جہاز لگاتار بمباری کرتے رہے تاکہ بڈھا کھنا پر لڑنے والے دستوں کو کوئی کمک نہ مل سکے۔ بڈھا کھنا پر موجود پلاٹون کی وجہ سے دشمن کو ہزیمت اٹھانا پڑی مگر بے سروسامانی کی حالت میں لڑنے والی اس پلاٹون پر دشمن نے بھر پور قوت لگا کر قبضہ کر لیا۔ جس وقت دشمن بڈھا کھنا پر کاروائی میں مصروف تھا۔ نائیک سیف علی نے دشمن کی حرکات اور طریقہ کار کا مشاہدہ کرتے ہوئے اپنی پلاٹون کو از سر نو ترتیب دیا اور ایسے طریقے سے دفاع پذیر کیا کہ دشمن جس سمت سے بھی آگے بڑھے اسے بھر پور طریقے سے روکا اور نیست و نابود کیا جائے۔ نائیک سیف علی کا دفاعی منصوبہ کچھ ایسے تھا کہ دشمن کے لئے دراوہ اور بھڑوٹ گالہ کی طرف بڑھنا بھی مشکل تھا چونکہ پیر کلیوا کے دفاعی حصار کو توڑے بغیر اس کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ بھڑوٹ گالہ اور دراوہ

کی طرف بڑھ کر اپنے لئے خطرہ مول لے۔ نائیک سیف علی جنجوعہ نے اپنی پلاٹون کی نفری بڑھانے کے لئے پچھلی ہی رات گاؤں کا دورہ کیا تھا اور کچھ مجاہد ساتھیوں کو اپنے ساتھ محاذ جنگ پر لے گیا تھا جس کی خبر ان کے کمانڈنگ آفیسر کو نہیں تھی۔ نائیک سیف نے کمال حوصلے، ہمت اور دانشمندی سے دشمن کے ہوائی حملوں کے دوران اپنے جوانوں کی پوزیشنیں بدل دیں اور انہیں اس طرح پھیلا کر لگایا کہ وہ چاروں طرف سے دشمن پر گولیوں کی بوچھاڑ بھی کرتے اور ایک دوسرے کو حفاظت بھی بہم پہنچاتے۔ اسلحے کی کمی کے باعث آپ نے ہر جوان کے لئے دو دو تین تین جگہیں منتخب کیں تا کہ کوئی گولی ضائع نہ ہو اور ہر گولی کے ساتھ دشمن کا ایک سپاہی کم ہو۔ پیغامات اور حالات سے آگاہی کے لئے آپ نے رسیوں اور جھنڈیوں کی مدد سے مختلف کوڈ ورڈ مقرر کئے تا کہ وہ زیادہ فاصلے پر لڑنے والے جوانوں کی کارکردگی سے باخبر رہیں۔

بڈھا کھنا پر قدم جمانے کے بعد دشمن نے پیر کلیوا، بھڑوٹ گالہ اور دراوہ پر یک مشت حملے کا آغاز کیا تو دشمن پر حیرت اور ہیبت طاری ہوگئی چونکہ ان تینوں مقامات پر لڑنے والی پلاٹونوں نے ابتداء ہی میں دشمن کی پہلی صفوں کو واصل جہنم کر دیا۔ دشمن کے ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور توپخانے نے تینوں مقامات پر آگ اگلنی شروع کی اور ہر ایک درخت اور پتھر پر کئی گولے برسا کر یقین کیا کہ مجاہدین وہاں سے ہٹ جائیں مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ یہ لوگ زندگی بچانے نہیں بلکہ موت کو گلے لگانے آئے ہیں۔ دشمن نے دوبارہ یلغار کی تو اسے پہلے سے بھی زیادہ نقصان اٹھانا پڑا مگر اس حملے کے دوران اسے دراوہ اور بھڑوٹ گالہ میں کچھ کامیابیاں حاصل ہوگئیں۔ دراوہ اور بھڑوٹ گالہ کی کامیابیاں اپنے عروج پر تب پہنچتیں جب پیر کلیوا بھی دشمن کے ہاتھ لگتا مگر یہ جگہ نائیک سیف علی جیسے تجربہ کار کمانڈر اور جرأت و جوانمردی کے پیکر اور ایک عاشق رسول ﷺ کی دسترس میں تھی۔ نائیک سیف علی کی

پوزیشن پر سارا دن دشمن حملہ آور ہوتا رہا اور پے در پے حملوں سے مجاہدین جام شہادت نوش کرتے اور اپنے ربّ سے ملتے رہے مگر پیر کلیوا پر دشمن قابض نہ ہو سکا۔ دو پہر کے بعد دشمن نے مزید کمک منگوا کر حملوں کا پھر سے آغاز کیا تو نائیک سیف علی جنجوعہ نے بھی اپنے مجاہدوں کی ترتیب بدل ڈالی اور انہیں دوبارہ مورچہ زن کر کے دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔ اسی دوران دشمن نے ہوائی جہازوں کی مدد سے حملے کی شدت بڑھائی تو نائیک سیف علی اُوٹ سے نکل کر ایک کھلی جگہ آ گئے جہاں سے وہ دشمن کے ہوائی جہاز کے آنے کی سمت کا تعین کر کے اس کا نشانہ لے سکیں۔ جونہی دشمن کے جہاز نے حملے کیلئے غوطہ لگایا نائیک سیف علی کی مشین گن نے آگ اگلنا شروع کر دی اور دشمن کا جہاز قریبی جنگل میں گر کر تباہ ہو گیا۔ دشمن کے جہاز کی تباہی کے بعد فضائی حملے میں کچھ تاخیر ہوئی تو اللہ کا یہ مجاہد اور دھرتی کا جیالا سپوت آگے بڑھ کر حملہ آور دشمن پر جھپٹ پڑا اور پیر کلیوا پر چڑھنے والے دشمن کے ایک دستے کا صفایا کر دیا۔ نائیک سیف علی نے یہ خطرہ اس لئے مول لیا چونکہ ان کی مشین گن اور دشمن کے دستے کے درمیان رکاوٹ تھی۔ اگر وہ اپنی پوزیشن سے فائیر کرتے تو دشمن نقصان اٹھائے بغیر سمت بدل لیتا اور دوسری جانب سے اوپر چڑھ جاتا۔ آپ نے اپنی مشین گن کو موثر طریقے سے استعمال کیا اور دشمن کے قریب کھلے میدان میں جا کر اسے نیست و نابود کر دیا۔ اس سے پہلے کہ پیر کلیوا کا یہ شاہین جگہ بدلتا اور مشین گن اٹھا کر کسی اور طرف جھپٹا کہ دشمن کی توپ کا ایک گولہ سیدھا ان پر آ گرا اور آپ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضاء میں بکھر گیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

نائیک سیف علی کی دعائیں ربّ کائنات نے قبول کرلیں اوراپنے اس بندے اور عاشق رسول ﷺ کوشہادت کا عظیم رتبہ عطا کیا۔ نائیک سیف علی کی شہادت کے بعد آپ کی پلاٹون نے سارا دن دشمن کا حملہ روکے رکھا اور یکے بعد دیگرے بہت سے مجاہدین جام شہادت نوش کرتے اپنے کمانڈر سیف علی کی راہ پر چلتے خالق حقیقی سے ملتے رہے۔ چھبیس اکتوبر کی شام کمانڈنگ آفیسر حیدری بٹالین کیپٹن محمد نواز نے مجاہدین کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیکر انہیں محفوظ مقام پر بلایا اور ساتھ ہی مجاہدین کے تازہ دستوں اور بچے کھچے جوانون کی مدد سے رات کے وقت دشمن پر جوابی حملہ شروع کردیا۔ ستائیس اکتوبر کی صبح تک کیپٹن محمد نواز نے دراوہ، بھڑوٹ گالہ اور پیرکلیوا پر حملہ آور افواج کا صفایا کرکے ان اہم مقامات پر پھر سے قبضہ جمالیا۔

شہادت سے پہلے

شہادت سے کچھ روز پہلے نائیک سیف علی اپنے گھر تشریف لائے جو کہ ان کی پوسٹ پیرکلیوا سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔آپ نے اپنی بیگم محترمہ زہرہ بی بی سے کہا کہ میری شہادت کے لئے دعا کرنا میری بیٹی تصویر بی بی اور بیٹوں محمد صدیق اور محمد رفیق کی پرورش دینی طریقہ سے کرنا اور انہیں تعلیم دلوانا۔انہیں تلقین کرنا کہ وہ میرے نقش قدم پر چلیں۔لالچ اور ہوس زر میرے خاندان کا کبھی وصف نہیں رہا میرے بچوں کو نصیحت کرنا کہ کسی لالچ میں آ کر خودداری نہ چھوڑیں۔نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کی خودداری، جرأت و بے باکی، بے لوث ایثار اور وطن سے محبت کا واضح ثبوت ان کی فقیرانہ اور درویشانہ زندگی اور بے غرض قیادت تھی۔آپ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ سپاہی تھے اور دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھنے کے بعد ایک تجربہ کار شخصیت کے بھی مالک تھے۔آپ خاندانی لحاظ سے بھی ایک معتبر اور منفرد مقام کے حامل تھے مگر ان تمام اوصاف کے باوجود آپ کے خمیر میں لالچ و ہوس، نمود و نمائش کی کوئی جگہ نہیں تھی۔آپ اگست 1947ء سے اکتوبر 1948ء تک سیاسی، سماجی اور عسکری میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے مگر اس کے باوجود آپ نے اپنے لئے کوئی لقب، عہدہ یا رتبہ منتخب نہ کیا۔آپ چاہتے تو اپنے نام کے ساتھ کوئی بڑا عہدہ لگا کر اپنے مجاہدوں کے ہمراہ کسی دوسرے سیکٹر میں چلے جاتے اور بھرپور مالی اور مادی فائدہ اٹھاتے جیسا کہ کچھ لوگوں نے کیا بھی مگر آپ کی منفرد شخصیت کبھی مادیت کی طرف مائل نہیں رہی اور شہادت کے بعد بھی آپ کی شخصیت کا یہ رنگ باقی ہے۔

ہلال کشمیر

نائیک سیف علی جنجوعہ کی شہادت کے بعد لیفٹیننٹ رحمت علی نے سب سے پہلے جائے شہادت دیکھی اور شہید کے جسم کے چند ٹکڑے سر کے بال اور بایاں ہاتھ پہچان کر اسے اسی جگہ دفنا دیا۔ آپ کے ہاتھ کی پہچان رائل انجینئرز میں نوکری کے دوران لاہور میں پیش آنے والا وہ واقع ہے کہ جہاں آپ نے بدمست گستاخ رسول ﷺ ہندو کو مارا اور اس نے آپ کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چبا ڈالا۔ نائیک سیف علی کی شہادت کو لیفٹیننٹ رحمت علی نے کچھ ان الفاظ میں بیان کیا۔

"نمبر 68775 نائیک سیف علی جنجوعہ شہید گاؤں کھنڈ ہاڑ تحصیل مینڈھر ضلع پونچھ 26 اکتوبر 1948ء کو پیر کلیوا کی پہاڑی پر مورچہ زن حیدری بٹالین کی ایک پلاٹون کی کمان کر رہے تھے۔ پیر کلیوا کی پہاڑی ہمارے دفاعی حصار میں نہایت ہی حساس اور اہم مقام تھا جس پر قبضہ کی صورت میں دشمن بڑا فائدہ اٹھا کر سارے دفاع کی صورت بدل دیتا۔ پیر کلیوا اور ملحقہ پہاڑیوں پر دشمن نے پوری اور حتمی منصوبہ بندی کے ساتھ ایک بریگیڈ انفنٹری جسے توپخانے، بکتر اور ہوائی فوج کی مدد حاصل تھی، بھرپور حملہ کیا مگر بہادر اور نڈر سیف علی نے دشمن کی منصوبہ بندی کو خاک میں ملاتے ہوئے پیر کلیوا کا دفاع ناقابل تسخیر بنا دیا۔ دشمن کی فضائی اور زمینی یلغار اور اس بات کا علم ہو جانے کے باوجود کہ ان کی پوزیشن دیگر دفاعی چوکیوں سے کٹ چکی ہے سیف علی نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے جوانوں کا حوصلہ بلند رکھا اور تب تک دشمن کو آگے نہ بڑھنے دیا جب تک کہ ان کا جسم دشمن کی توپ کے گولے کی زد میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گیا۔ نائیک سیف علی جنجوعہ کی جرأت بے باکی اور بے لوث قیادت ہمارے بہادر مجاہدوں کے لئے مشعل راہ ہے"۔

آزاد کشمیر ڈیفنس کونسل کا اجلاس

مورخہ 14 مارچ 1949ء کو آزاد کشمیر ڈیفنس کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ ڈیفنس میٹنگ نمبر 46 میں کاروائی کے دوران قرارداد نمبر 258ء پیش کی گئی جس میں نائیک سیف علی جنجوعہ شہید کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے آزاد کشمیر کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہلال کشمیر دیا گیا۔

"اٹھارہ آزاد کشمیر رجمنٹ کے نائیک سیف علی جنجوعہ شہید جو 26 اکتوبر 1948ء کو علاقہ کھنڈ ہاڑ، تحصیل مینڈھر پونچھ کے اہم اور حساس فوجی مقام پیر کلیوا پر ایک پلاٹون کی کمان کر رہے تھے نے دشمن کے ایک بریگیڈ کا حملہ ناکام بنا کر اسے حزیمت سے دوچار کر دیا۔ نائیک سیف علی شہید پر دشمن نے پیدل فوج، توپخانے، ہلکے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی مدد سے حملہ کیا مگر ان کی جرأت اور بہادری کے سامنے دشمن کی مادی قوت خاک میں مل گئی۔ سارا دن لڑائی کے بعد دشمن نے پیر کلیوا کو دیگر دفاعی چوکیوں سے الگ تھلگ کر دیا اور ہر سمت سے دباؤ بڑھانے کے باوجود اسے کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید ایک جرأت مند سپاہی با حوصلہ قائد اور سرزمین کشمیر کے بے باک سپوت تھے۔ شہادت سے قبل آپ نے اپنی مشین گن سے دشمن کا ایک ہوائی جہاز مار گرایا اور حملہ آور سپاہ پر بھرپور کاروائیاں کرتے ہوئے اس کی پیش قدمی کے تمام راستے بند کر دیئے۔ نائیک سیف علی دوران جنگ دشمن کی توپ کا گولہ لگنے سے شہید ہوئے اور ان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ نائیک سیف علی نے جس جرأت، دلیری اور ہمت سے یہ معرکہ تمام تر مشکلات اور بے سروسامانی کی حالت میں لڑا اسے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حکومت آزاد کشمیر

انہیں اعلیٰ ترین فوجی اعزاز ہلال کشمیر عطا کرتی ہے۔ یہ اعزاز پاکستان کے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشان حیدر کے مساوی تسلیم کیا جائے گا۔"

گمنام ہیرو

نائیک سیف علی جنجوعہ شہید (ہلال کشمیر) کی شہادت کا واقع 26 اکتوبر 1948ء کو پیش آیا۔ شہادت کے لحاظ سے نشان حیدر پانے والوں میں آپ کا نمبر دوسرا ہے۔ چونکہ اس سے پہلے میجر طیفل شہید (نشان حیدر) سابقہ مشرقی پاکستان میں داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کر چکے تھے مگر افسوس کہ جدوجہد آزادی کشمیر کے اس ہیرو کی میجر طفیل اور کیپٹن راجہ سرور شہید کی طرح میڈیا میں کوئی پذیرائی نہ ہوئی اور نہ ہی ملک کے دانشوروں اور اہل قلم نے جرأت و بہادری کے اس پیکر کی شخصیت کو عوام الناس میں متعارف کروانے کی طرف کبھی دھیان دیا۔ درویشی نائیک سیف علی جنجوعہ شہید (ہلال کشمیر) کا خاندانی وصف تھا۔ آپ کی بیوہ نے اپنے شہید خاوند سے کیا ہوا وعدہ پورا کرتے ہوئے اپنے بچوں کی تربیت خالصتاً دینی انداز میں کی اور کسی دنیاوی لالچ اور مادی چاہت کی طرف دھیان نہ دیا۔ مگر افسوس کہ آزاد کشمیر کی کسی حکومت اور قائد نے کبھی بھی اس عظیم شخصیت اور شہید کا ذکر اپنے کسی پیغام میں نہیں کیا اور نہ ہی ان کے ورثاء کو اس اعزاز کے شایان شان کوئی مراعات دیں۔ تحریک آزادی کشمیر کو ہر حکومت اپنے منشور میں اہمیت دیتی ہے اور 1947ء کے شہیدوں اور غازیوں کو اپنے اپنے انداز میں خراج عقیدت بھی پیش کرتی ہے مگر اعلیٰ ترین اعزاز پانے والے سیف علی شہید کا کبھی کسی نے ذکر نہیں کیا۔ 4 نومبر 1985ء کو آزاد کشمیر کے وزیر مال جناب ملک محمد یوسف نے آزاد کشمیر اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کرتے ہوئے حکومت آزاد کشمیر سے مطالبہ کیا کہ نائیک سیف علی جنجوعہ (ہلال کشمیر) کو پاکستان کے دیگر شہداء اور یہ اعزاز پانے والی شخصیات کے لواحقین کے برابر مراعات دی

جائیں مگر حکومت نے اس قرارداد کو کوئی اہمیت نہ دی اور نہ ہی ہلال کشمیر پانے والے شہید کو نشان حیدر پانے والوں کی صف میں شامل کروا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی ویژن، اخبارات اور دیگر سول اور فوجی مقامات اور اطلاعات کے مراکز میں جہاں نشان حیدر پانے والوں کی تصاویر سرکاری طور پر یا پھر نوجوان نسل کو اپنے ہیروز سے متعارف کروانے کے لئے آویزاں کی جاتی ہیں وہاں نائیک سیف علی شہید نشان حیدر یا ہلال کشمیر کے لئے پچاس سال تک کوئی جگہ میسر نہ تھی۔

شہداءکشمیر کے کارناموں کا اعتراف

زندہ قومیں اپنے ہیروز کے کارناموں کو کبھی نہیں بھلاتیں بلکہ آزادی کی جنگیں لڑنے والوں کے کارناموں کو مشعل راہ بنا کر آئندہ کیلئے لائحہ عمل تیار کرتی ہیں۔ سکاٹ لینڈ کا ولیم والس ہو یا عمر مختار یا مارشل ٹیٹو، دنیا کے کسی بھی ملک اور قوم کا کبھی یہ شیوہ نہیں رہا کہ وہ دھرتی کے لئے لہو کا نذرانہ پیش کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے بھول جائیں اور کاغذی ہیروز اور مادی منفعت کے متلاشیوں کو آگے لا کر حقیقت پر پردہ ڈال دیں۔ جو قومیں اس طرح کے شعبدہ بازوں کے شکنجے میں جکڑی جائیں ان کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہوتا۔ اس بات سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ پچھلے پچاس سالوں سے جاری تحریک آزادی کشمیر جو کہ حقیقتاً تحریک الحاق پاکستان ہے کے اصل ہیروز اور ان کے عظیم تر کارناموں کے ساتھ اہل علم وقلم نے وہ برتاؤ نہیں کیا جو ان کی شان کو دوبالا کرتا اور آنے والی نسل کے خون کو گرمانے اور اس تحریک کو نئی قوت اور سمت دینے کا موجب بنتا۔

ایک عرصہ خاموشی کے بعد سابق چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالوحید خان، آزاد کشمیر رجمنٹ کے سابق کرنل کمانڈنٹ جناب لیفٹیننٹ جنرل (ر) سردار ایف۔ایس۔ کے لودھی، جناب لیفٹیننٹ جنرل (ر) ضیاء اللہ خان، سنٹر کمانڈنٹ جناب بریگیڈیئر (ر) محمد اکبر خان اور بریگیڈیئر (ر) عبدالقیوم خان کی کوششوں سے آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر میں تحقیق کا شعبہ قائم کیا گیا جس نے اپنی محنت اور کوشش سے آزاد کشمیر رجمنٹ کی تاریخ چھپوا کر بہت سے گمنام ہیروز کے معرکوں سے فوج اور قوم کو روشناس کروایا اور اہلیان کشمیر پر ایک عظیم

احسان کیا۔ یہ تاریخ اپنی جگہ ایک بہترین کوشش ہے جو خالصتاً فوجی انداز میں لکھی گئی ہے اس لئے ان مجاہدین اور شہداء کے نجی اور سماجی مسائل کی طرف رہنمائی نہیں کرتی۔ اس طرح وقت کی کمی اور حقیقی جستجو میں نرمی کے باعث شہداء کے تمام تر دوستوں، عزیزوں اور غیر معروف شخصیات سے ملنا بھی ایک مشکل امر واقع ہوا ہے جس کا احاطہ شائد شعبہ تاریخ آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر نہیں کرسکتا۔ اس کام کے لئے ضروری ہے کہ حکومت آزاد کشمیر کا کشمیر لبریشن سیل دانشوروں اور محققین کی ایک جماعت اس کام پر لگائے تاکہ تحریک آزادی کے ان عظیم فرزندوں کے کارناموں سے اہلیان کشمیر کو روشناس کروا کر اس تحریک میں ایک نئی روح پھونکی جائے۔

نائیک سیف علی جنجوعہ شہید (ہلال کشمیر) کے عظیم کارنامے کو منظر عام پر لانے کے لئے ان کی رجمنٹ کے جناب لیفٹیننٹ کرنل امان اللہ خان کی کوششیں بھی قابل تحسین ہیں جن کی بدولت ایک عرصہ بعد حکومت پاکستان نے مورخہ 29 فروری 1996ء کو نائیک سیف علی خان کو ملنے والے اعزاز ہلال کشمیر کو نشان حیدر کے برابر قرار دیا۔ مگر افسوس کے تاحال نہ تو شہید سیف علی کی کوئی یادگار حکومت نے تعمیر کروائی اور نہ ہی اس درویش صفت شخصیت کے لواحقین کی کسی قسم کی مالی مدد کی گئی۔ نائیک سیف علی جنجوعہ شہید (ہلال کشمیر) کا گھر آج بھی سفید پوشی اور خودداری کا وہی نمونہ پیش کرتا ہے جو پچاس سال پہلے شہید کی زندگی میں تھا۔ شہید کی عمر رسیدہ بیوہ، بیٹی اور دونوں بیٹے ہر آنے والے مہمان کو وطن کشمیر کا مہمان سمجھ کر ان کی پذیرائی کرتے ہیں اور قطعاً شکوہ کناں نہیں کہ حکومت نے ان کی دیکھ بھال نہیں کی۔ آپ کا بڑا بیٹا محمد صدیق جنجوعہ ایک عرصہ تک آزاد کشمیر رجمنٹ میں سروس کرتا رہا مگر ایک حادثے میں ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے ریٹائر ہوگیا۔ دوسرا بیٹا انتہائی معصوم اور شریف النفس ہے اور گھر کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ محمد صدیق جنجوعہ نے اپنے باپ کی شناخت

کی جنگ بڑے ہی معصومانہ انداز سے لڑی اور آزاد کشمیر کی ہر حکومت کو باور کروانے کی کوشش کی کہ وہ آزادی کا چراغ روشن کرنے والوں کو نہ بھلائے مگر تاحال کسی حکمران کو آزادی کی اس نعمت کی قدر کرنے کا خیال نہیں آیا۔

تلخ حقائق

سلطان محمود غزنی سے اپنا لشکر لیکر چلا تو ایک بادہ خوار نے بادشاہ کا راستہ روک کر پوچھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔محافظوں نے بادہ خوار کی گرفت کی تو بادشاہ نے انہیں منع کر دیا۔ سلطان بادہ خوار سے مخاطب ہو کر بولا کہ وہ تسخیر ہند کا ارادہ رکھتا ہے۔ بادہ خوار نے قہقہ لگایا اور طنزیہ انداز میں بولا: کیا غزنی میں عدل وانصاف اور خوشحالی کا دور دورہ ہے کہ تم ہند میں امن قائم کرنے جا رہے ہو۔

دانشمند محمود نے لشکر کو رک جانے کا حکم دیا اور واپس اپنے دفتر شاہی میں جا بیٹھا۔ افسروں، وزیروں، امیروں، سرداروں اور منصب داروں کو حکم دیا کہ ساٹھ یوم کے اندر اندر اپنے اپنے علاقہ کے عوامی مسائل درست کریں، ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کریں، جہاں عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے انہیں پورا کریں، شاہی خزانے کا ضروری حصہ جس سے فوج اور دوسرے محکموں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں کے علاوہ سارا خزانہ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کر دیا جائے۔

ساٹھ روز بعد سلطان نے ساری سلطنت میں منادی کروائی کہ جہاں کسی کو کسی وزیر، مشیر، اور حکومتی اہلکار کے خلاف شکایت ہو وہ تیس روز کے اندر براہ راست سلطان کے دربار سے رجوع کرے۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی جاری کیا کہ جھوٹے شکایتی کی گردن ماردی جائے اور سچی شکایت کا ازالہ کیا جائے اور انعام بھی دیا جائے۔

اس سے پہلے کہ شکایات کنندگان سلطان کے دربار میں پہنچتے، حکومتی اہلکار، وزیر،

مشیر اور قاضی دوڑے دوڑے ان بھوکوں،ننگوں کے دروں پر سوالی بن کر پہنچ گئے اور جہاں جہاں جس جس کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی اس کا ازالہ کیا،معافیاں مانگیں اور بادشاہ سے رحم کی اپیل کی۔مورخ لکھتا ہے کہ تیس یوم کی مدت کے بعد صرف ایک شخص بادشاہ کے حضور پہنچا اور بادشاہ سے بڑی عجیب شکایت کی جو محمود ہی کے خلاف تھی۔یہ شکایتی وہی بادہ خوار تھا جس کے طنز نے بادشاہ کو حکومتی اور ملکی معاملات درست کرنے کا اشارہ دیا تھا۔

بادہ خوار بے نیازی سے سلطان سے مخاطب ہوا اور بولا حقوق العباد اور حقوق اللہ میں اعتدال ضروری ہے۔کچھ وقت اپنے اہل خانہ کیلئے اور کچھ اپنی ذات کیلئے مختص کرو۔ تمہاری زندگی رعایا کے لئے ضروری ہے۔اچھا قائد اور رہنما عوام کے لئے قدرت کا عطیہ ہے۔

یاد رہے کہ سلطان محمود دن رات امورِ سلطنت میں مصروف رہتا اور جو وقت ملتا عبادت الٰہی میں گزار دیتا۔کام کی وجہ سے وہ اکثر بیمار رہتا اور آخر کار سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر دارفانی سے کوچ کر گیا۔

غزنی کا محمود ایک حقیقت تھا اور آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کا نام تاریخ میں زندہ ہے۔حقیقت زندگی ہے جبکہ بے حقیقت زندگی بھی مردگی ہے۔آج تحریک آزادی کشمیر نو دولتیے لیڈروں،ٹن وزیروں،مشیروں اور اہلکاروں سے ہی نہیں بلکہ بادہ خواروں میں بھی خود کفیل ہے۔مگر نہ ہی ان بادہ خواروں میں عقل و دانش ہے اور نہ ہی سلاطین و امراء میں حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت ہے۔

آزاد کشمیر دستور ساز اسمبلی دنیا کی واحد اسمبلی ہے جہاں علماء و مشائخ بھی موجود ہیں مگر بادہ خوار تو کجا آج کسی عالم دین اور شیخ کامل میں بھی اتنی سکت نہیں کہ وہ حکمرانوں سے پوچھے کہ کیا آپ نے آزاد کشمیر کے معاملات درست کر لئے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کی فتح کے

ڈھنڈورے پیٹ رہے ہو۔کیا آزاد کشمیر میں عدل وانصاف کا بول بالا ہےاورعوام سکھ کی نیند سوتے اور چین کی بانسری بجاتے ہیں کہ آپ مقبوضہ کشمیر والوں کے مسائل حل کرنے کی سوچ رہے ہو۔کیا کسی ایک سیاسی لیڈر، سیاسی دانشور، صحافی، گدی نشین، پیراور سیاسی صوفی اورشیخ کا ایسا کردار ہے جو میری بات کی نفی کرے؟

تاریخ تحریک آزادی کشمیر وانقلاب پونچھ 1947ء کے مصنف محترم سردار گلزار حجازی نے اپنی تصنیف کے صفحہ 122 پر عدل ومساوات کی ایک تاریخی مثال پیش کی کہ جب چرچل سے کسی نے پوچھا کہ کیا اس جنگ عظیم میں برطانیہ عظمیٰ کی حکومت برقرار رہے گی۔ چرچل نے چیف جسٹس سے دریافت کیا کہ کیا برطانوی عوام کو انصاف مل رہا ہے اور عوام عدلیہ سے مطمئن ہیں۔ چیف جسٹس نے اثبات میں سر ہلایا تو چرچل نے برجستہ حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں جب تک ہماری عدالتیں اور جج انصاف فراہم کررہے ہیں ملک اور حکومت کو کوئی خطرہ نہیں۔

سردار حجازی صاحب نے اسی صفحہ پر حضرت علیؓ کا تاریخی قول بھی نقل کیا ہے کہ کفر کی حکومت تو چل سکتی ہے مگر ظلم کی نہیں۔ میں یہاں کنفیوشس کے ایک قول کا اضافہ کرتا چلوں کہ درندوں سے نبھا تو ہوسکتا ہے مگر بے حس اور ظالم حکمرانوں سے نہیں۔

پچھلے صفحات پر میں نے پاکستانی صحافت کے حوالے سے میرے ساتھ پیش آنے والے واقع کا ذکر کیا ہے جب مجھے روزنامہ صحافت والے نائیک سیف علی جنجوعہ شہید (ہلال کشمیر) کو نشان حیدر لکھنے کے جرم میں اسلام آباد پولیس کے حوالے کرنے والے تھے تو میں نے غازی ملت، اورتب کے صدر آزاد کشمیر سردار محمد ابراہیم خان کے اسلام آباد نمبر پر فون کیا تو ان کے ذاتی معاون نے میرا مسئلہ دریافت کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں فلاں اخبار کے دفتر میں بیٹھا ہوں اور نائیک سیف علی کی شہادت کا مقدمہ لڑ رہا ہوں۔ اخبار کے دفتر کا نام

سنتے ہی حجازی صاحب کے قائد تحریک، کشمیری قوم کے قائد ملت، آزاد کشمیر کے بانی صدر اور وقت کے حاضر سروس صدر آزاد کشمیر کے معاون نے فون بند کر دیا۔

راقم نے دوسرا نمبر ملایا تو محترم صدارتی معاون نے منت کی کہ بھائی خدا کے لئے پیچھا چھوڑو ہمیں تنگ نہ کرو ہمیں اس ملک میں جینے دو ہم وقت گزار رہے ہیں ہم اخبار والوں سے نہیں الجھنا چاہتے۔ تمہارا سیف علی جہاں شہید ہوا ہے اسے وہیں دفنا دو صدر صاحب جنازے میں نہیں آسکتے۔

کیا سردار حجازی اور دیگر کشمیری دانشور اس حقیقت کا سامنا کرنے کو تیار ہیں کہ ان کے غازی ملت، بانی صدر اور بعد میں کئی بار عہدہ صدارت پر فائز رہنے والے قائد تحریک نے اپنے ہی لوگوں سے ان کے قومی ہیرو کو کیوں متعارف نہیں کروایا؟ انہیں آزاد کشمیر کے تعلیمی نصاب میں ہلال کشمیر کے باب کا اضافہ کرنے سے کس نے منع کیا تھا؟ کیا قائد تحریک کی یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ آنے والی کشمیری قوم کو سیف علی جنجوعہ شہید اور تحریک آزادی کشمیر کو اپنے خون سے جلا بخشنے والوں سے روشناس کرواتے تا کہ آزادی کے بیس کیمپ کا ہر بچہ سیف علی شہید کے نقش قدم پر چل کر آزادی کو اپنا مقدر بنالیتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ تحریک کے ان بانیوں نے تحریک کی تقدیر افغانوں، سرحدی قبائلی سرداروں، کشمیر کے حالات سے بے خبر پاکستانی لیڈروں اور نوکر شاہی کے حوالے کی اور خود آزاد کشمیر کی حکومت پر قابض ہو گئے۔ اپنے دوستوں یاروں کو کیپٹن جنرل، فیلڈ مارشل، کرنل اور میجر کے عہدوں پر فائز کیا اور چاپلوس قلمکاروں نے ان خود ساختہ فیلڈ مارشلوں، جرنیلوں اور کرنیلوں کی بہادریوں کے کارناموں کے قصے لکھے جبکہ راہ حق میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں سے قوم کو بے خبر رکھا۔

اگر ہمارے قائدین قوم، تحریک اور مادر وطن کشمیر سے مخلص ہوتے تو قائد تحریک

اور صدر آزاد کشمیر کے ذاتی صدارتی معاون کو جن کا تعلق یقیناً آزاد کشمیر ہی سے ہوگا اور موصوف پڑھے لکھے بھی ہوں گے کو اتنا علم ضرور ہوتا کہ نائیک سیف علی شہید ہلال کشمیر کون تھا۔

یوں تو ہر سال چھ ستمبر کو ہم یوم دفاع پاکستان مناتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل یوم دفاع پاکستان 26 اگست 1947ء کا وہ دن ہے جب 17 اگست 1947ء کو مہاراجہ کے بدنیتی پر مبنی فیصلے اور ریڈکلف ایوارڈ کی ظالمانہ شقوں کے خلاف میر پور، کوٹلی اور خاص کر پونچھ کے غیور عوام نے دفاع پاکستان کا یکطرفہ فیصلہ کیا اور مسلمانان پاکستان کے ساتھ یکطرفہ یک جہتی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ڈوگرہ راج اور کانگریسی قیادت کی چانکیہ نیتی پر مبنی سازش کے خلاف اعلان جہاد کیا۔

پاکستانی قیادت اور اہل علم و دانش اگر اس تحریک کا عمیق جائزہ لیں تو انہیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا کہ اگر موجودہ آزاد علاقے کے عوام بغیر کسی مدد کے اپنے اپنے علاقوں میں ڈوگروں کے خلاف مسلح بغاوت نہ کرتے تو آج اس ملک کا جغرافیہ کچھ اور ہوتا۔ مگر افسوس کے پاکستانی قائدین نے ہر مخلص اور محبّ وطن لیڈر اور قائد کی تذلیل کی اور ہر چاپلوس، ابن الوقت اور جی حضوریے کو زبردستی کشمیری عوام پر مسلط کر کے تحریک آزادی کی روح کو حقیقت سے فریب میں بدل دیا۔

اگر ہمارے سیاسی اور فوجی قائدین تدبر جرأت اور احساس ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تو شاید 71،65ء اور 99ء کی جنگیں لڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور آج نہ صرف کشمیر آزاد ہوتا بلکہ پاکستان بھی ایک خوشحال اور حقیقی خودمختار ملک ہوتا۔

جن دنوں طالبان اتحادیوں کے ڈیزی کٹر بموں، بمبار طیاروں اور کروز میزائلوں کا اپنی کلاشنکوفوں سے مقابلہ کر رہے تھے تو بی بی سی پر جہاد کے نام، اقسام اور طریقہ کار پر

بحث ومباحثہ کا ایک دور چلا جس میں علماء کرام نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق اور دائیں بائیں دیکھ کرتا کہ کوئی سن نہ لے کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاد کی تشریح کی جس سے جہاد اکبر کی ایک پرانی اصطلاح کو نیا رنگ دیکر جہاد کو تعلیم ،صحت ، انفارمیشن ٹیکنالوجی تک محدود کرنے کا پروگرام بنا جس پر ساری زندہ امت نے تصدیق کی مہر ثبت کردی چونکہ زندہ رہنے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی جہاد کرنے والوں سے عالمی مالیاتی ادارے خوش ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ بحث چند سال پرانی ہے جبکہ بعد میں اے آر وائی ٹیلی ویژن پر جو ٹیلی انٹرویوز چلے ان میں پاکستان کے سابق وزیر داخلہ نصیراللہ بابر اور ریٹائرڈ جنرل حمید گل کا نمبر اکثر آتا رہا اور اے آر وائی کے ڈاکٹر شاہد مسعود نے جنرل صاحبان سے خفیہ اداروں کے متعلق کچھ سوال کئے تو جنرل صاحبان کا فرمان تھا کہ ان اداروں کا وہ کام نہیں جس کا ان پر الزام لگایا جاتا ہے بلکہ ان اداروں کا کام حالات و واقعات کی روشنی میں آنے والے حادثات سے بچاؤ کی تدبیریں کرنا اور ملکی سلامتی کو درپیش خطرات سے حکومت کو آگاہ کرنا ہے تاکہ حکومت چلانے والے ذہین وفطین اشخاص خفیہ اداروں کی جانب سے دی جانے والی اطلاعات اور تجزیات کی روشنی میں ایسی پالیسیاں مرتب کریں کہ حادثات ٹل جائیں یا پھر ان سے بچاؤ اور دفاع کا قبل از وقت انتظام کرلیا جائے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جب مہاراجہ کشمیر نے اپنی دوغلی پالیسی شروع کردی اور سرینگر میں پاکستان کے سپرنٹنڈنٹ آف ڈاک کو کام بند کرنے کا حکم دے دیا اور ہندوستان سے ڈاک اور تار کا معاہدہ کرلیا اور شیخ عبداللہ کو کانگریسی لیڈر شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہوگئے۔شیخ عبداللہ کو جیل سے رہا کردیا گیا، مسلم کانفرنس سے کانگریسیوں نے نیشنل کانفرس بنوا ڈالی، پنڈت کاک جو مسلمانوں اور مسلم لیگ سے نرم رویہ رکھتا تھا کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا

دیا گیا، انگریز چیف آف آرمی سٹاف اور انسپکٹر جنرل آف پولیس کو ہٹا کر ہندوؤں کو ان اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا گیا، راشٹریہ رائفل، سیوک سنگھ اور دوسری دہشت گرد ہندو تنظیموں کو کشمیر میں مسلم کش کاروائیوں کی آزادی مل گئی، سٹیٹ آرمی کے مسلمان کوارٹر ماسٹر جنرل کرنل عدالت کو ہٹا کر ہندو کوارٹر ماسٹر جنرل لگا دیا گیا تو یہ سب حالات و واقعات پاکستانی سیاسی اور عسکری قیادت کو کیوں سمجھ میں نہ آئے اور ان کی جانب سے کوئی خفیہ قدم کیوں نہ اٹھایا گیا۔

ایک عام آدمی کے سامنے اگر یہ واقعات نمودار ہوتے تو اس طرح کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ بھی اپنا بچاؤ کرتا مگر وہ لیڈر اور قائد جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی رکھوالی اور رہنمائی کا بیڑہ اٹھائے ہوئے تھے خواب غفلت سے چنداں بیدار نہ ہوئے۔ بانی پاکستان قائداعظمؒ نے جب آرمی چیف کو کشمیر پر فوج کشی کا حکم دیا اور آرمی چیف نے قائداعظمؒ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو پھر بھی فوجی قیادت میں ہلچل پیدا نہ ہوئی اور عسکری قیادت اپنے انگریز سینئر آفیسروں کی ماتحتی میں کشمیریوں کے قتل عام کی خبریں سنتی رہی۔

آزادی کشمیر کی اس جنگ میں جن پاکستانی فوجی افسروں نے اپنے طور پر حصہ لیا اور کشمیری مسلمانوں کی اس تحریک کیلئے اپنی جانوں اور عہدوں کی پرواہ کئے بغیر میدان جہاد میں شریک ہوئے انہیں بھی اس غلطی کی سزا بھگتنا پڑی۔ میجر جنرل اکبر خان اپنی کتاب ''ریڈرزان کشمیر'' کے صفحہ 80 پر لکھتے ہیں کہ یہ جان کر دکھ ہوا کہ مجھے تین ماہ کی تنخواہ سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں تین ماہ تک اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہا ہوں۔ جنرل اکبر مزید لکھتے ہیں کہ اس پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ سلیکشن بورڈ نے میری اس غلطی پر کہ میں اپنے طور پر تحریک آزادی کشمیر میں کیوں شریک ہوا مجھے اگلے عہدے پر یعنی میجر جنرل نہ بنانے کی سفارش کی اور مجھ سے جونیئر دو افسروں کو میجر جنرل بنا دیا گیا۔ میں نے

اس پر با قاعدہ احتجاج کیا تو تب جا کر شنوائی ہوئی۔ میجر جنرل اکبر خان کا صرف ایک واقع نہیں بلکہ جن فوجی افسروں اور جوانوں نے اپنے طور پر تحریک میں حصہ لیا انہیں بھی اس کا مزہ چکھایا گیا تا کہ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کرے۔

قائداعظمؒ کا حکم نہ ماننے والوں میں صرف انگریز کمانڈر انچیف ہی نہیں تھا بلکہ پاکستانی کابینہ بھی اس جرم میں برابر کی شریک تھی۔ ڈاکٹر محمد سرور عباسی نے اپنی تصنیف تحریک پاکستان کے سیاسیات کشمیر پر اثرات کے صفحہ 134/135 پر چوہدری غلام عباس مرحوم کے کالم ''قائداعظمؒ سے آخری ملاقات'' کے زیر عنوان ستمبر 1967ء کے ہفت روزہ کشمیر راولپنڈی میں چھپنے والے بیان کو نقل کیا ہے۔ چوہدری غلام عباس لکھتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے فرمایا کہ "میں نے دہلی سے جنرل آکنلیک کو فون پر کہا کہ وہ اٹھائیس اکتوبر کو لاہور آ کر مجھ سے ملے۔ آکنلیک لاہور آیا تو میں نے اس سے کشمیر کے معاملات پر تبادلہ خیال کیا مگر آکنلیک نے واضح طور پر کہہ دیا کہ اگر پاکستان نے بھارت کے خلاف کشمیر پر فوج کشی کی تو وہ انگریز افسروں کو پاکستانی فوج سے واپس لے جائے گا۔"

ایک دوسرے کالم میں چوہدری غلام عباس لکھتے ہیں کہ قائد نے میرے ساتھ گفتگو کے دوران بتلایا کہ میں نے کمانڈر انچیف کو جموں کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا اور کہا کہ کشمیر کی خاطر اگر بھارت سے جنگ چھڑ جاتی ہے تو مجھے اس کی پرواہ نہیں مگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد میں نے کابینہ کا اجلاس طلب کر کے یہی تجویز اپنے رفقاء کے سامنے رکھی مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میری کابینہ نے متفقہ طور پر میری تجویز مسترد کر دی۔ اس لئے کہ کشمیر کے معاملے میں ہم نہ صرف صحیح بس کھو بیٹھے بلکہ غلط بس پر بٹھا دیئے گئے۔

قائداعظمؒ کے اس بیان کی سردار محمد ابراہیم خان نے بھی تائید کی ہے۔ وہ "متاع

زندگی" میں لکھتے ہیں کہ ''قائداعظمؒ نے سخت الفاظ میں کہا کہ کشمیر حکومت کے ممبران کی کم ہمتی کی وجہ سے بھارت کے قبضہ میں گیا'' آج وہ لوگ جوان سیاستدانوں اورفوجی افسروں سے متعلق من گھڑت قصے کہانیوں سے اہل کشمیر کو بے وقوف بنائے ہوئے ہیں وہ نہ صرف اہل کشمیر کے بلکہ اپنے ضمیر کے بھی مجرم ہیں۔ ہمارے ہاں روایت بن گئی ہے کہ ہم ہر بات دوسروں کے سرتھوپنے اور خودفریبی کا برقعہ اوڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے گریبان میں نہیں دیکھتے بلکہ دوسروں کی خامیاں ڈھونڈتے ہیں اور واویلا کرتے ہیں کہ ہماری ہر خامی، بے وقوفی اور کم عقلی کا ذمہ دار انگریز اور امریکہ ہے۔ آج قوم ان سیاستدانوں اورفوجی قائدین سے کیوں نہیں پوچھتی کہ اگر انگریز کمانڈر انچیف نے انکار کردیا تھا تو کابینہ تو آپ کی اپنی تھی۔ انگریز جرنیل کرنیل تھے کوئی سٹور کیپر تو نہیں تھے۔ پچھلے صفحات پر بیان کردہ واقعات ان قائدین کے سامنے تھے جن کی روشنی میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا تھا۔ اگر یہ لوگ کشمیراورکشمیریوں سے مخلص ہوتے تو سردار ابراہیم اور دوسرے کشمیری قائدین کو یکجا کر کے میرپور اور پونچھ کے ساٹھ ہزار ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کرتے اور اسے مسلح کر کے کسی حکمت عملی کے تحت لڑاتے اور بھارت کو کشمیر میں داخل ہونے کا موقع ہی نہ ملتا۔ آج اگر پاکستانی سیاستدان اپنی برادریوں، دوستوں یاروں اور خدمت گاروں کے لئے مفروروں کی فوجیں بھجوا کر انہیں الیکشن میں دھاندلی، زمینوں پر قبضے اور کرپشن میں معاونت کے لئے بھرپور مدد دیتے ہیں تو کشمیر کی آزادی اور کشمیری قوم کی مدد کے لئے کوئی کیوں نہ آیا۔ بھارت تو ازلی دشمن ہے ہی اور ہندو ہمیں مسلمان سمجھ کر ظلم کرتا ہے مگر جو رویہ اپنوں کا ہے اس کی طرف کوئی کیوں نہیں دیکھتا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ کشمیر کا فیصلہ 1947ء میں ہوگیا تھا جس کا اعلان ہونا باقی ہے۔ کشمیر مجاہدین نے اپنے طور پر بغیر کسی مرکزی کنٹرول اور قائد کے اپنے اپنے علاقوں میں

آزادی کی جنگ لڑی جسے بعد میں کچھ شاطروں نے کیش کرانے کے لئے آزاد علاقوں میں اپنے چہیتے بھجوا کر انہیں ایک بار پھر فتح کیا اور اپنے نام کے جھنڈے لگا کر مادی مفادات حاصل کئے۔

اگر بھارت نے اپنی فوجیں کشمیر میں اتارنے سے پہلے بارہ مولہ اور نوشہرہ میں پٹیالہ رائفلز کی بٹالین بھجوا رکھیں تھیں تو پاکستانی فوج کے جوان، افسر اور ہتھیار بھی خفیہ طور پر کشمیر بھیجے جا سکتے تھے۔ مگر کسی کو کشمیر سے دلچسپی نہیں تھی اس لئے ایسا نہیں ہوا۔ بھارت کو انگریز نے جتنا علاقہ دینا تھا اس پر قبضہ ہونے دیا اور جو اس وقت بھارت کے لئے ضروری نہیں تھا اسے آزاد کشمیر کے طور پر آئندہ کے لئے پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک مستقل تناؤ برقرار رکھنے کی وجوع بنا دیا گیا تاکہ خطے میں بڑی قوتوں کی گریٹ گیم جاری رہے اور ان قوتوں کی بے جا مداخلت کا جواز بھی برقرار رہے۔

1947ء1948ء کی مسلح جدوجہد کا آغاز جموں سے ہوا جہاں ایک ہی ہفتہ کے اندر بیس ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے اور پچیس ہزار عورتوں کو اغواء کر کے پنجاب کے مختلف اضلاع میں بھیج دیا گیا۔ اس خونی واردات کی خبر سنتے ہی پونچھ کے غیور عوام نے مسلح بغاوت کا آغاز کیا جس کی بازگشت پورے کشمیر میں سنی گئی۔ پونچھ میں مسلح کاروائیوں کا آغاز ہوتے ہی میر پور، کوٹلی، اور بھمبر میں بھی مقامی لوگوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ اسی دوران قبائلی لشکر بھی جہاد آزادی میں شامل ہوئے اور سرینگر تک پہنچ گئے ''عوامی مسلح جنگ اور کشمیر'' کے مصنف میجر جہانگیر چوہدری اپنی کتاب کے صفحہ 138 پر لکھتے ہیں کہ 1948ء میں مجاہدین دفاعی جنگ لڑتے رہے اور پسپائی اختیار کرتے رہے جبکہ قبائلی لشکریوں نے 25 نومبر 1947ء کو ہی کشمیر سے راہ فرار اختیار کر لی۔ اس دوران بھارتی فوجیں جنہیں فضائیہ کی بھرپور مدد حاصل تھی مقامی کمانڈروں پر برتری حاصل

کر چکی تھیں۔

اسی صفحہ پر مصنف نے مزید لکھا ہے کہ 1948ء کے وسط میں پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے حکومت کو تجویز پیش کی کہ اگر مجاہدین اسی طرح پسپائی اختیار کرتے رہے تو پاکستان کی اپنی سرحدیں اور سالمیت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا پاکستانی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کشمیر میں مداخلت کی جائے اور دشمن کو اوڑی، پونچھ اور نوشہرہ لائن پر روکا جائے۔ عقل والوں کے لئے سوچ کا مقام ہے کہ چند ماہ پہلے تک جو کمانڈر انچیف بانی پاکستان کے حکم کو ٹال گیا اسے چند ماہ بعد پاکستان کی سالمیت کا کیسے خیال آ گیا اور وہ خود ہی ایک تجویز لیکر کیسے میدان میں آ گیا۔ ایک طرف پاکستانی فوج ایک مجوزہ دفاعی لائن پر پہنچی اور دوسری جانب بھارت مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں لے گیا اور آئندہ کے لئے اپنی فوجی اور سیاسی پوزیشن مضبوط کرتا گیا۔

دونوں ممالک کے درمیان ایک لائحہ عمل پر اتفاق ہوا اور اقوام متحدہ کے نمائندوں نے سیز فائر لائن کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ اس سیز فائر کے بعد بھی بھارت نے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور جب بھی موقع ملا سیز فائر لائن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اہم پہاڑی مورچوں اور دفاعی لحاظ سے بہتر مقامات پر قابض ہوتا رہا جس کی بڑی مثال سیاہ چین گلیشیر پر بھارت کا قبضہ ہے۔

1971ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد شملہ معاہدہ ہوا تو سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن میں بدل دیا گیا جس کی وجہ سے تحریک آزادی کشمیر کو ایک نیا دھچکا لگا۔ شملہ معاہدہ ایک ایسی چال ہے جسے دونوں ممالک اپنی اپنی فتح سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف بھارت ہی کی فتح تھی چونکہ پاکستان کو صرف جنگی قیدی واپس ملے جس کے صلے میں کشمیر کا مسئلہ بھارت اقوام متحدہ سے واپس دہلی لے آیا اور آئندہ کے لئے اسے اپنی مرضی سے حل کرنے کا

فیصلہ کرلیا۔

تحریک آزادی کشمیر کو ایک مشکوک صورت حال سے دوچار کرنے کے صلے میں ہی شاید بیرسٹر سلطان محمود چوہدری نے میر پور میں بھٹو پارک بنایا ورنہ تحریک آزادی کے لئے خون دینے والوں کو بھول کر محض سیاسی اور مادی مفادات کے حصول کی خاطر ایسی فضول خرچیاں اور کوئی جواز پیش نہیں کرسکتیں۔ بھٹو صاحب ایک انقلابی شخصیت تھے اگر وہ چاہتے تو سچے انقلابیوں کو آگے لاکران سے کام لیتے مگر کشمیر کے معاملے میں سوائے اقوام متحدہ میں کی جانے والی جذباتی تقریر کے اور کوئی ایسی چیز نہیں جسے ایک واضح حقیقت کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ یہ بھی ایک کڑوی حقیقت ہے کہ بھٹو کی وزارت خارجہ کے دور میں جناب کے ایچ خورشید کو دلائی کیمپ میں قید کر کے دلائی کیمپ کو تاریخ میں ایک اہم مقام دیا گیا اور اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیئے کہ شمالی علاقہ جات کو کشمیر سے الگ کرنے اور پاکستان کا صوبہ بنانے پر شمالی علاقوں سے ڈوگرہ حکومت کا خاتمہ کرنے والے ایک مرد مجاہد کرنل حسن مرزا اور جناب ذوالفقار علی بھٹو میں شدید اختلافات پیدا ہوئے جس کی پاداش میں کرنل حسن مرزا مرحوم کو بھی پابند سلاسل کردیا گیا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کا قیام ہے جو کہ تحریک آزادی کشمیر کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی اور کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے۔ گو کہ مسلم کانفرنس والے اپنے آپ کو مسلم لیگ کی شاخ سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں یہ ایک سیاسی بیان بازی ہے۔ تاریخی لحاظ سے مسلم کانفرنس کی بنیاد مسلم لیگ سے سالوں پہلے رکھی گئی تھی جبکہ مسلم لیگ والوں نے سوائے قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے کبھی مسلم کانفرنس والوں سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔

اس میں شک نہیں کہ قائداعظمؒ نے ہمیشہ کشمیری قوم کے حقوق اور جذبات کا

احترام کیا۔ وہ کشمیری قائدین سے صرف کشمیر اور کشمیریوں کی بات کرتے تھے اور کشمیری قیادت کو سیاست کے بنیادی اصولوں اور وطن پرستی کا درس دیتے تھے۔ قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ ظرفی کے مقابلے میں پنڈت نہرو کشمیری لیڈروں کو نجی تعلقات کے جال میں پھنسانے کے درپے رہتے اور گاندھی انہیں چاپلوسی اور سیکولرازم کے گرداب میں گھیرتے رہتے۔ کانگرسی لیڈروں نے شیخ عبداللہ کی نفسیات کا جائزہ لیا اور ان کے احساس کمتری کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ان کی شادی ایک نومسلم خاتون سے کروائی تا کہ کشمیر کا یہ فصیح و بلیغ نعت خوان، قاری اور ابھرتا ہوا سیاسی لیڈر اپنی غربت کو جھاڑ کر نیڈو ہوٹل کی سہولیات کا عادی ہو جائے۔ شیخ صاحب جو اپنی جوانی میں عاشق رسول ﷺ تھے۔ نہرو، گاندھی اور حکومت برطانیہ کے مریدین میں شمار ہونے لگے۔ شادی کے بعد وہ غریبوں کے لیڈر نہیں بلکہ کانگریس کے ماؤتھ پیس بن گئے۔ ان کی شادی اور کانگریسی صحبت کا اثر ان کے دل و دماغ پر اتنا حاوی ہوا کہ انہیں قائداعظمؒ اور مسلم لیگ سے شدید نفرت ہوگئی۔ شیخ نے اپنے دل کا بغض اپنی خودنوشت (آتش چنار) کے صفحات پر قلم بند کیا اور اپنے آپ کو قائداعظمؒ کا ہم پلہ سیاسی قائد منوانے کی ادھوری کوشش کی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کشمیر کی غلامی میں مسلم لیگ اور شیخ عبداللہ دیگر عناصر کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں۔ شیخ عبداللہ شادی کے بعد اکثر لاہور آتے چونکہ ان کے سسرالی انگریز لاہور میں مقیم تھے۔ اگر مسلم لیگی قیادت چاہتی تو شیخ عبداللہ کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ان کی پسند کا راگ، ساگ اور روٹی مہیا کرتی اور انہیں چاپلوسی کا حلوہ کھلا کر مسلم کانفرنس ہی میں رکھتی۔ شیخ کو چونکہ مسلم لیگ والے لفٹ نہیں کرواتے تھے اور انہیں ایک بڑے کشمیری لیڈر اور قائد کا درجہ نہیں دیتے تھے جس وجہ سے شیخ بددل ہو کر کانگریس کی طرف مائل ہوا جہاں یہ سارے لوازمات اس کے منتظر تھے۔

شیخ نے کانگرس کے اشارے پر مسلم کانفرنس کو دوٹکڑے کیا اور نیشنل کانفرنس بنا کر تحریک آزادی کشمیر پر چرکا لگایا۔ بعد کے حالات بھی ایسے ہی تھے کہ مسلم لیگ نے کبھی مسلم کانفرنس کو اپنا حصہ نہیں بلکہ باجگزار بنا کر رکھا۔ مسلم لیگی قیادت کی حکومت آزاد کشمیر میں مداخلت بیجا اور ڈکٹیشن سے تنگ آ کر چوہدری غلام عباس مرحوم نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی اور میر واعظ بددل ہو کر واپس مقبوضہ کشمیر چلے گئے۔ رہی سہی کسر مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے نکالی اور مسلئہ کشمیر کو کنفیوژن کا شکار کر دیا۔ بھٹو نے نہ صرف جنگی قیدیوں کے بدلے میں سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن میں بدل دیا بلکہ آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کو منظم کر کے اسے آزاد حکومت بھی سونپ دی۔ آزاد کشمیر پیپلز پارٹی چونکہ پاکستان پیپلز پارٹی کا حصہ ہے اور آزاد کشمیر پیپلز پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت اور چیئرمین کی حکم عدولی نہیں کر سکتی اور ان کے ہر حکم اور اشارے پر لبیک کہنے کی پابند ہے اس لئے اس کی کوئی کشمیر پالیسی اور تحریک میں حصہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور میں تحریک آزادی کشمیر کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی یہ جماعت کشمیریوں کی نمائندہ جماعت ہے اس لئے اس کا آزادی کے بیس کیمپ میں حکومت کرنا اور الیکشن لڑنا تحریک آزادی کی نفی اور تحریک کے بنیادی اصولوں سے انحراف ہے۔

چونکہ پاکستان پیپلز پارٹی کی کوئی مقبوضہ کشمیر شاخ نہیں اور نہ ہی اس جماعت کا جہاد آزادی میں کوئی عملی حصہ ہے اس لئے ایک جماعت کو زبردستی ایک قوم پر مسلط کرنا اور ایک محکوم اور غلام طبقے کی برین واشنگ کر کے انہیں ان کے حقیقی مقصد یعنی آزادی کی جنگ لڑنے کے بجائے ڈھائی گز زمین کی حکمرانی کے لئے باہم لڑانا انسانی حقوق اور انسانی اخلاقی اصولوں کی بھی خلاف ورزی ہے۔

شملہ معاہدے کے معرض وجود میں آنے کے بعد جو زمینی اور ظاہری تبدیلیاں کشمیر

میں ہوئیں ان کا بیان بھی ضروری ہے۔شملہ معاہدے نے سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن بنایا تو مسئلہ کشمیر بین الاقوامی حیثیت سے گر کر باہمی حیثیت اختیار کر گیا۔یعنی یہ مسئلہ اب ہندوستان اور پاکستان کا باہمی مسئلہ بن گیا جسے دونوں فریق کشمیریوں کی شمولیت کے بغیر شملہ معاہدے کے تحت باہمی گفت شنید کے ذریعے حل کرنے پر راضی ہو گئے۔ حیرت کی بات ہے کہ ساڑے تین سو سال سے اپنی آزادی کے لئے لڑنے والے کشمیریوں کا اس معاہدے میں کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی کبھی کسی کشمیری لیڈر نے اس نقطے کی طرف دھیان دیا ہے۔آج اس نقطے کو بنیاد بنا کر بھارت ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے اور کھلے عام آزاد کشمیر پر فوج کشی کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

شملہ معاہدے کے بعد آزاد خطہ میں جو حکومتیں قائم ہوئیں انہیں آزاد کشمیر میں بسنے والے عوام سے کم اور کشمیری مہاجرین سے زیادہ ہمدردیاں ہوگئیں۔صدیوں سے آباد کشمیری مہاجرین جو صرف کشمیر میں ہونے والی جنگوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ بعض قدرتی آفات اور تلاش روزگار کے سلسلے میں پاکستان میں آباد ہوئے اور صدیاں بیت جانے کے بعد ان کی نئی نسلوں کو کشمیر سے کوئی سروکار نہیں رہا، ان کی آزاد اسمبلی میں سیٹوں کی بھرمار ہونے لگی ہے۔مہاجرین کی ان خصوصی سیٹوں نے آزاد کشمیر کی سیاست میں جو گل کھلائے اور جس طرح کے قائد اور لیڈر اسمبلی میں بھجوائے ان کی داستانیں بیان کرنے کے لئے علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔سوائے جناب ثناء اللہ قادری اور شاہ غلام قادر کے کوئی بھی ایسا سیاسی لیڈر اس طبقہ میں نہیں جس کا ڈائرکٹ تعلق خطہ زمین سے ہو۔یہ لوگ پاکستان میں بھی جائیدادیں، نوکریاں، کاروبار اور ووٹ کا حق رکھتے ہیں اور پاکستانی سیاسی قائدین اور پارٹیوں کے نمائندے مہاجرین کی صورت میں آزاد کشمیر کے خزانے سے بھی حصہ لیتے ہیں۔یہ لوگ وزیر مشیر بھی بنتے ہیں اور سوائے اپنی برادریوں کے باقی آزاد کشمیریوں کو نفرت اور حقارت سے

دیکھتے ہیں۔ یہی حال نوکریوں کا ہے۔ ہر محکمے میں مہاجرین کی مخصوص سیٹیں ہیں جس پر یہ لوگ اپنا خاندانی حق سمجھ کر قابض تو ہو جاتے ہیں مگر آزاد کشمیر کے عوام کے لئے کام کرنا ان پر فرض نہیں۔ یہ لوگ تنخواہیں اور دوسری مراعات لینے اور چھٹیاں گزارنے آزاد کشمیر آتے ہیں۔ ان کا رہن سہن بود و باش طرز معاشرت گفت وشنید، نشست و برخاست کسی بھی لحاظ سے آزاد کشمیر والوں سے نہیں ملتا اور نہ ہی یہ تنخواہ دار حاکم آزاد کشمیر والوں سے ملنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح مقبوضہ کشمیر کی سیاست میں بھی تبدیلیاں آئیں اور مقبوضہ وادی اور جموں میں مسلمانوں کی نسل کشی کا نیا دور شروع ہو گیا جبکہ بھٹو صاحب کو زندگی نے مہلت نہیں دی کہ وہ آزاد کشمیر کو پانچواں صوبہ بنانے کا باقاعدہ اعلان کرتے۔ پاکستان کے اندرونی حالات اور سردار عبدالقیوم خان اور کرنل حسن مرزا جیسے سیاسی مخالفین کے ڈر کی وجہ سے بھی بھٹو مرحوم اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے ورنہ یہ مسئلہ ستر کی دہائی میں ہی حل ہو جاتا۔

حیرت کی بات ہے کہ پاکستانی حکمرانوں اور پاکستانی عوام کا کشمیر اور کشمیریوں سے رویہ انتہائی مختلف ہے۔ پاکستانی عوم نے کشمیر کی آزادی کے لئے ہمیشہ جان ومال کی قربانی دی اور بغیر کسی صلے کے اپنا سب کچھ کشمیری مسلمانوں کے لئے وقف کیا مگر حکمران طبقے کا رویہ اس کے برعکس رہا۔ اس سلسلہ کی چند حقیقی مثالیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ گنگا ہائی جیکنگ کیس میں مقبول بٹ شہید پر جو مظالم شاہی قلعہ لاہور میں ڈھائے گئے اسے بیان کرنا آسان نہیں۔

محمد سعید اسعد نے شہید مقبول بٹ کے جیل سے لکھے گئے خطوط پر مبنی شعور فردا کے عنوان سے ایک تاریخی دستاویز ترتیب دی۔ یہ خطوط جن لوگوں کے نام ہیں وہ معاشرے کے عام لوگ ہیں جو صرف وطن کی مٹی سے محبت کرتے ہیں اور اس مٹی کی آبرو کی حفاظت

کرنے والوں کا احترام کرتے ہیں۔ان عظیم لوگوں میں ایک درویش مرحوم اکرام اللہ جسوال بھی تھے جنہیں میں عرصہ تک میر پور کے احاطہ کچہری میں ایک پرانے ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھے دیکھتا رہا۔مرحوم نے اپنی ساری زندگی عشق آزادی کے روگ میں گزار دی اور کبھی کسی حکمران کے آگے سر جھکایا نہ کوئی صلہ طلب کیا۔یہ خطوط ذاتی نوعیت کے ہیں جن میں سوائے عزم مصمم اور جدوجہد آزادی کے لئے ثابت قدم رہنے کے اور کچھ بھی نہیں مگر اس تحریر کو بھی حکومت نے ضبط کر لیا اور اس کی تشہیر پر پابندی عائد کر دی۔

شعور فردا کے صفحہ 27 پر مصنف لکھتے ہیں کہ جب عدالت عالیہ نے گنگا ہائی جیکنگ کے ملزمان کو بری کیا تو آزاد کشمیر اور پاکستانی عوام نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔بعد میں حکومت پاکستان نے ان لوگوں سے کوہاٹ کے ٹانڈہ ڈیم ریسٹ ہاؤس میں مذاکرات کیئے اور انہیں تحریک آزادی کشمیر سے دستبردار ہونے کو کہا۔اس کے صلے میں انہیں بڑی بڑی آسائشیں دینے کا وعدہ کیا مگر وطن کی مٹی کے ان رکھوالوں اور عشق آزادی کے دیوانوں نے حکمرانوں سے کوئی معاہدہ نہ کیا۔کتاب کے صفحہ اٹھائیس پر لکھا ہے کہ وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے مقبول بٹ شہید سے منگلا قلعہ میں ملاقات کی اور بٹ صاحب سے درخواست کی کہ اگر وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں تو آزاد کشمیر کی وزارت عظمیٰ ان کے حوالے کر دی جائے گی۔شہید کشمیر نے بھٹو صاحب کی آفر ٹھکرا دی اور انہیں صاف جواب دیا کہ ان کی منزل آزادی ہے نہ کہ ڈھائی اضلاع کی وزارت عظمیٰ۔بہت سے کشمیری مجاہدین اور انقلابی رہنماؤں کا بیان ہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو مقبول بٹ شہید کی قائدانہ صلاحیتوں، غربت، خودداری اور خود اعتمادی سے ڈر لگتا تھا۔مقبول بٹ نے بھٹو صاحب سے میٹنگ کے دوران آزاد کشمیر کی وزارت عظمیٰ کی آفر ٹھکرا دی اور ان سے درخواست کی کہ ان کی تنظیم کو آزاد کشمیر میں ٹریننگ کیمپ بنانے اور کشمیری قوم کو جہاد آزادی

کے لئے تیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ بھٹو صاحب کو خدشہ تھا کہ جو لوگ بھارتی اور پاکستانی جیلوں اور ٹارچر سیلوں کی سختیاں برداشت کر چکے ہیں وہ کہیں ان کے لئے وبال جان نہ بن جائیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بھٹو صاحب نے مقبول بٹ شہید سے درخواست کی کہ وہ مقبوضہ کشمیر چلے جائیں اور وہاں تحریک کو متحرک کریں اس سلسلہ میں وہ مقبول بٹ شہید کی مالی مدد کریں گے۔ بٹ صاحب مقبوضہ کشمیر تو چلے گئے مگر کسی نے ان کی خبر نہ لی بلکہ کسی کی مخبری پر بھارتی فوج اور انٹیلی جنس نے ان کی کھوج لگانا شروع کر دی۔ بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی وجہ سے بٹ صاحب پہلے قید ہوئے اور پھر شہید کر دیئے گئے۔

اس قسم کے واقعات اور حقائق کی ایک لمبی فہرست جناب لیفٹیننٹ کرنل ایم۔ اے۔ حق مرزا کی ڈائری میں موجود تھی مگر افسوس کہ 1947ء اور 1965ء کے اس حقائق نامے کو ''مرجھائے چنار'' کے نام سے حکومت نے چھاپ کر حقیقت کو بھی مرجھا دیا۔ ہماری قوم کا ایک المیہ سچائی پر پردہ ڈالنا اور جھوٹ کی تشہیر کرنا بھی ہے۔ اگر کشمیری قوم خوش فہمی اور خود فریبی کے بھنور سے نکل کر حقیقت کا سامنا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ آزادی کی منزل قریب نہ آئے۔ اگر ہم بھٹو اور ضیاء الحق کی مدح سرائی اور فرسودہ نظریات کی جنگ میں یوں ہی جتے رہے تو آزادی کی جنگ لڑنے اب قبائلی نہیں آئیں گے۔ بھٹو ازم اور اب زرداری ازم میں لیڈروں کے لئے بہت سے مالی فائدے، اسمبلی کے ٹکٹ، مخصوص نشستیں، نوکریاں، ٹھیکیداریاں اور کرپشن سے بچاؤ کی تدبیریں تو ہیں مگر عزت اور آزادی نہیں۔ اگر بھٹو صاحب واقعی کشمیر کاز سے منسلک تھے تو وہ کم از کم نائیک سیف علی جنجوعہ کے ہلال کشمیر کو نشان حیدر میں ضم کر جاتے اور شہید کے بچوں کی کفالت اور بہتری کا ہی کچھ سوچتے۔ مگر آج تک کسی لیڈر اور حاکم کو اس کا خیال نہیں آیا۔ سیف علی شہید ہلال کشمیر آزادی کی منزل کا ایک

نشان ہے جبکہ سیاستدان اور حکمران آزادی کے نام پر بھیک مانگتے نہیں شرماتے اور آزادی کے ان نشانوں سے خوف کھاتے اور ان سے دوری ہی میں آفیت سمجھتے ہیں۔

سرنگاپٹم میں ایک یادگار آزادی کے کسی متوالے نے انگریزوں کی حکمرانی کے دور میں تعمیر کی۔ یہ یادگار اس مقام پر تعمیر کی گئی تھی جہاں شیر ہند سلطان ٹیپو کی تلوار گری تھی۔ یہ یادگار ہر خاص و عام کے لئے باعث عبرت تھی اور جو بھی اس یادگار کے قریب جاتا ایک نیا جذبہ اور ذوق لیکر آتا۔ کچھ عرصہ پہلے بال ٹھاکرے نے حکم دیا کہ اس یادگار سمیت مسلمان حکمرانوں کی دیگر یادگاروں اور نشانات کو مٹا دیا جائے اور ان مقامات پر مندر، پارک، سیاحت گاہیں، شراب خانے وغیرہ تعمیر کئے جائیں چونکہ ان یادگاروں اور عظمت و حریت کے نشانوں سے ہندوؤں کو خوف آتا ہے اور مسلمانوں کا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ یہ یادگاریں اور نشانات مسلمانوں میں جذبہ حریت بیدار کرتے ہیں جس سے ہندو اقتدار کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اسی خوف اور ڈر کی وجہ سے شر پسند ہندو، ہندوستان میں مسجدیں، مزارات خانقائیں اور مسلمان حکمرانوں، شہیدوں اور حریت پسندوں کی یادگاریں مٹا رہے ہیں۔

بال ٹھاکرے کا خوف تو قابل فہم ہے مگر آزاد کشمیر کے حکمرانوں کو کس بات کا خوف ہے اس کا فیصلہ کشمیری عوام پر چھوڑتا ہوں۔

اظہار تشکر

یہ سال 1942ء تھا اور مہینہ ستمبر کا، یورپ میں خزاں کا راج تھا اور ہٹلر کی فوجیں ایک قوت کیساتھ یورپ کو روندتی ہوئیں وسطی ایشیاء کے تیل کے خزانوں کو پانے کے لئے روس سے معرکہ آرا تھیں۔ یورپ کی تاریخ میں 1942ء کا سال اور اسٹالن گراڈ کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ یہی وہ شہر تھا کہ جہاں یورپ کے مقدر کا فیصلہ ہوا۔

جرمن فوجیں روسیوں کو لوہے کے چنے چبوا چکیں تھیں، بے شمار لاشیں اور لامحدود تباہی روس کا مقدر بنی۔ ہر سپاہی کو یہی بتایا گیا تھا۔ کہ ''اے سرزمین روس کے جانبازو! اس جنگ میں فتح یا موت مقدر ہے''۔ اسٹالن گراڈ میں غضب کا رن پڑا اور جرمن یہاں بھی آگے بڑھتے رہے۔ روسی فوج کے سالار اس بات پر حیران تھے کہ آخر کون سا ایسا لائحہ عمل اپنایا جائے جو جرمن فوج کو روک سکے۔

روسی فوج کا سالارِ اعلیٰ غضب اور قہر کے عالم میں اپنے افسروں سے مخاطب ہے وہ چیخ رہا ہے اور سب سے پوچھتا ہے کہ کوئی ہے جو بتائے کہ ہم کیسے جرمن فوج کو روک سکتے ہیں۔ افسران کی قطار خاموش اور خوف زدہ کھڑی ہے ایسے میں پچھلی صف سے ایک جونیئر پولیٹیکل افسر کی نحیف سی آواز بلند ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے ''ہم جرمنوں کو روک سکتے ہیں! اگر ہم اپنے سپاہیوں کے دلوں سے موت کا خوف نکال دیں اور ان میں یہ حوصلہ پیدا کریں کہ تمہاری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہمیں ہمارے بہادروں کی داستانیں عام لوگوں تک پہنچا کر انہیں عہد شباب میں اپنے آپ کو قربانی کے لئے تیار کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ یہ

جنگ جرمن کے ساتھ روس کے تحفظ کے لئے ہے ہمیں سرزمین روس کے بہادروں کی آواز بننا ہوگا اور جو کام بندوق کی گولی نہیں کر پائی قلم کرے گا............''

پولیٹیکل آفیسر جذبات میں اتنا کچھ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے، کمرے میں کھڑے افسران پہ خاموشی کے تالے لگ جاتے ہیں مگر سالارِ اعلیٰ کے خاموش ذہن میں اُبال آتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس جوان افسر کے پاس ہی وہ لائحہ عمل ہے جو روس کے شباب کو قربانی کے لئے تیار کر سکتا ہے۔

''ہلال کشمیر'' لکھتے ہوئے میرے خاموش ذہن میں اس طرح کے خیالات ضربیں لگاتے رہے کہ آخر کیوں مادرِ وطن کے اُن غیور بیٹوں کی داستانیں وقت کی ستم ظریفیوں اور جاری نظام کے اجارہ داروں کی خود فریب پالیسیوں تلے دب گئیں ہیں؟

میرے حوصلے ٹوٹتے اور بنتے رہے، میں لکھتا پھر رک جاتا مگر میرے والدین، دوستوں، اور وطن کی مٹی کی خوشبو نے میری اس جدوجہد کو عملی شکل دینے میں میری مدد کی اور یوں یہ مسودہ آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کسی بھی مقبول تحریک آزادی کے لئے ایک مستحکم اور جاندار فکری مہم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میں نے اپنے وطن عزیز کے اس عظیم سپوت کی داستان شجاعت بیان کر کے یہ کوشش کی ہے کہ ماضی کے چند حقائق کو زیست کے پردوں پہ لایا جائے۔

میں کرنل منصور رشید (آئی ایس پی آر) کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے ہفت روزہ ہلال میں سیف علی جنجوعہ (شہید) کی داستان حریت کو جگہ دلوا کر میرے لئے "ہلال کشمیر" کی راہ ہموار کی۔

آخر میں میں اپنے والدین کی دعاؤں کا اور اس محبت کا شکر گزار ہوں کہ میرے بے وطنی کے دنوں میں میرے لئے ڈھال ہیں۔ میرے حوصلے ٹوٹتے بنتے ہیں جبکہ ان کی

دعائیں نعمت خداوندی کی طرح جاری وساری ہیں۔

میری اللہ سبحان تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے لفظوں میں سچائی کو قائم رکھیں تا کہ میں حق بات کہہ سکوں۔اس مسودے میں شامل سب بہتر اللہ رب العزت کی طرف سے ہے جبکہ کوئی بھی کوتاہی خالصتاً میری طرف سے ہے۔

انوار ایوب راجہ

کتابیں

(۱) القرآن

(۲) تاریخ خلافت اسلامی — جناب محمد نورالدین اویسیؒ

(۳) کوہستان قراقرم سے بحر قردین تک — جی ایم میر

(۴) کشمیر شناسی — جی ایم میر

(۵) جموں کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں — جی ایم میر

(۶) کشمیر ساگا — سردار محمد ابراہیم خان

(۷) کشمیر تاریخ کے آئینے میں — ایم اے خان

(۸) راج ترنگنی — پنڈت کلہن

(۹) کشمیر چنگاری سے شعلوں تک — جگموہن

(۱۰) آزادی — خالد حسن

(۱۱) ماس ریزسٹنس ان کشمیر — طاہر امین

(۱۲) کشمیر سولڈ اینڈ ری سولڈ — ایس ایم جعفر

(۱۳) کشمیر ناؤ آر نیور — عبدالحفیظ توقیر

(۱۴) نوشتہ دیوار — اعجاز احمد فاروقی

(۱۵) کشمیر کے چراغ — صغیر قمر

(۱۶) کشمیر کی قومی آزادی اور پاکستان — شبیر احمد چوہدری

(۱۷) تاریخ بلتستان — غلام حسین سہروردی

(۱۸) ان سائیڈ کشمیر — پریم ناتھ بزار

(۱۹)	مسئلہ کشمیر	پروفیسر محمد عارف
(۲۰)	تاریخ اقوام پونچھ	محمد دین فوق
(۲۱)	ودرنگ چنار	کرنل ایم اے حق مرزا
(۲۲)	شعور فروا	محمد سعید اسد
(۲۳)	کشمیری قوم اپنی منزل کی تلاش میں	جی ایم میر
(۲۴)	میرے والد ایک فریب خردہ کشمیری	خالد رحیم
(۲۵)	مطالعہ کشمیر	پروفیسر ایم نذیر احمد تشنہ
(۲۶)	ہسٹری آف آزاد کشمیر رجمنٹ	آزاد کشمیر رجمنٹل سنٹر
(۲۷)	پارلیمنٹ سے بازار حسن تک	ظہیر احمد بابر
(۲۸)	اصلی ضیاء الحق	رفیق ڈوگر
(۲۹)	پاکستان لیڈرشپ چیلنج	لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان
(۳۰)	آزاد کشمیر	پریم ناتھ بزاز
(۳۱)	عکس کشمیر	ڈاکٹر صابر آفاقی
(۳۲)	ریڈرزان کشمیر	میجر جنرل محمد اکبر خان
(۳۳)	روزنامہ نوائے وقت لاہور	13،14 اکتوبر 1999ء
(۳۴)	روزنامہ صحافت اسلام آباد	5 ستمبر 1999ء
(۳۵)	روزنامہ خبریں اسلام آباد	18 اگست 1999ء
(۳۶)	روزنامہ پاکستان اسلام آباد	26 فروری 2000ء
(۳۷)	ارتھ شاستر	جانکیہ کوتیلیہ
(۳۸)	عوامی مسلح جنگ اور کشمیر	میجر جہانگیر احمد چوہدری

(۳۹) تاریخ تحریک آزادی کشمیر (انقلاب پونچھ 1947ء)	سردار محمد گلزار حجازی
(۴۰) عظیم سیاسی مفکرین	شاہد مختار
(۴۱) تحریک پاکستان کے سیاسیات کشمیر پراثرات 47-1940ء	ڈاکٹر محمد سرور عباسی
(۴۲) وہ جہاں گرے	ٹم نیو آرک
(۴۳) کشمیر آن کراس فائر	وکٹوریہ شوفیلڈ
(۴۴) آتش چنار	شیخ عبداللہ
(۴۵) شمس بری	پہاڑی ویلفیئر سوسائٹی سرینگر
(۴۶) قائداعظمؒ کی یادیں	کے ایچ خورشید
(۴۷) آخری کمانڈر ان چیف	جنرل گل حسن
(۴۸) تاریخ چب	پروفیسر اقبال
(۴۹) ماہنامہ عکاس راجپوت	مارچ 1998ء
(۵۰) انوارالاولیاء (حیات حضرت بابا شادی شہید)	نظامت اوقاف آزاد کشمیر ستمبر 1983ء
(۵۱) گریٹ گیم	پیٹر ہوپ کرک
(۵۲) گم گشتہ قوم	شوکت حیات
(۵۳) مذاکرات سے مارشل لاء تک	سردار محمد عبدالقیوم خان
(۵۴) پولیٹیکل اویکنگ ان کشمیر	راوندر جیت کور
(۵۵) لینٹھا	انوار ایوب راجہ